معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

۱۷۵ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۵ء تا ماہ جون ۲۰۰۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

مضامینِ معارف

۱۷۵ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۵ء تا ماہ جون ۲۰۰۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

تلخیص

جلد ۱۷۵ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۵ء عدد ۱

فہرست مضامین

---

email : shibli academy @ rediffmail. com : ای میل

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

۲۶؍ دسمبر ۲۰۰۴ء کی صبح جنوب مشرقی ایشیا میں صبح قیامت بن گئی، سمندری زلزلے اور طوفانی لہروں کے تھپیڑے طوفان نوح کا نمونہ پیش کرنے لگے اور نگاہ تصور کے سامنے فرعون کے مع لاؤ لشکر سمندر میں پھینکے جانے کا منظر آ گیا، ایران کے شہر بام کا زلزلہ بھی اس قیامت خیز طوفان کے سامنے ہیچ نظر آنے لگا، اس تباہی و بربادی نے پورے خطے کو ہلا اور ساری دنیا کو دہلا دیا، سب سے زیادہ انڈونیشیا اس کی لپیٹ میں آیا ہے، تھائی لینڈ، ملیشیا، مالدیپ، سری لنکا اور ہندوستان میں جزائر انڈومان و نکوبار اور اڑیسہ، تامل ناڈو، پانڈیچری اور آندھرا پردیش بھی طوفان کی قہر سامانی کی زد میں آئے، اب تک کی اطلاع کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمی نَسیًا مَنسیًا ہو چکے ہیں، زخمیوں اور خانماں بربادوں کی تعداد اس سے کئی گنا سوا ہے، آبادیاں نیست و نابود ہو گئی ہیں، گھروں میں سوئے ہوئے لوگ سوتے ہی رہ گئے، صبح صبح سمندر کی سیر کا لطف لینے والے تہ آب چلے گئے، کھیل کود میں مصروف بچے لقمۂ اجل بن گئے، تعطیل گزارنے کے لیے گھر چھوڑ کر جانے والوں کو اپنے گھروں میں واپس آنا اور خاندان والوں سے ملنا نصیب نہیں ہوا، غرض جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا اور ان کی بے گور و کفن لاشیں زبان حال سے کہہ رہی ہیں:

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے   نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

سانپ نکل جانے کے بعد اب لکیر پیٹنے کا عمل شروع ہو گیا ہے اور ماہرین فن اور سائنس داں قیاس آرائیاں کر رہے ہیں اور اسباب و علل کی تحقیق و تفتیش میں سرگرداں ہیں مگر ابھی تک کسی قطعی اور یقینی نتیجے تک نہیں پہنچے ہیں، ایک بہت عام بات جو اس طرح کے موقعوں پر اکثر کہی جاتی ہے، اس دفعہ بھی کہی جارہی ہے کہ پہلے سے یہ پتہ کرلیا گیا ہوتا تو اس قدرتی آفت سے بچا جا سکتا تھا، دوسرے اگر یہ ممالک قدرتی آفتوں کی پیشگی خبر دینے والی اور فضائے بسیط میں نصب کی جانے والی سٹیلائٹ تنظیم کے رکن ہوتے تو اتنے بڑے پیمانے پر تباہی نہ آتی، یہ خبر بھی آئی ہے کہ سنامی لہروں کے طوفان کے بارے میں امریکہ میں موجود مشاہداتی مراکز کو اطلاع ہو گئی تھی اور اس نے امریکی سفارت خانوں، فوج اور حکومت آسٹریلیا کو خبر بھی دے دی تھی مگر چوں کہ ایشیائی ملکوں کے ساتھ ایسا کوئی رابطہ نہیں

تھا کہ انہیں اطلاع دی جاتی، دوسرے یہ کہ وہ اس معاہدے کے رکن بھی نہیں ہیں، اس طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری ہی رہے گا کہ دوسرے حادثے کی اطلاع آجائے گی، ہندوستان کے وزیر اعظم نے بجا طور سے اسے قومی آفت قرار دے کر یہ کہا ہے کہ ہندوستانی قوم خود اس سے نمٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس طرح کے حوادث میں ایک مسلمان کی نظر صرف برق و بخارات تک محدود نہیں رہتی جو فیضان سماوی سے محروم قوموں کا انداز فکر و نظر ہے ؎

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم   حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

بلاشبہ قرآن مجید نے بھی کہا ہے کہ یہ ساری کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے اور اس کے تصرف میں بادل اور ہوائیں بھی ہیں اور شمس و قمر اور بحر و بر بھی ؎

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں   یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں

کون سائنس اور ٹکنالوجی کی برتری کا انکار کرے گا، اس کے کرشمے اور کمالات ہر دیدہ بینا کو نظر آتے ہیں، اس کی بدولت انسان نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، ستاروں پر کمندیں ڈالیں، سیاروں کو مسخر کیا، چاند میں بستیوں کا پتا لگایا، مریخ پر پودے اگانے کی تیاری کی مگر زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنا اور اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنا اسے نصیب نہ ہوا اور نہ یہ راز اس پر منکشف ہوا کہ آدمی خدا کی مرضی اور مشیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، اس طرح کے واقعات بخت و اتفاق سے نہیں ہوتے، اللہ کے حکم سے ظہور میں آتے ہیں، قرآن نے اسی لیے نچنت اور بے فکر ہو جانے پر متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تصرف اور قوت تسخیر کے باوجود تم اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہو وہ جب چاہے اچانک دبوچ لے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا، وہ کہتا ہے کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر راتوں رات آفت آجائے اور وہ سو رہے ہوں اور دن چڑھے ان پر ہمارا عذاب آدھمکے جب وہ کھیلتے ہوں اور سارے علم و آگہی اور واقفیت و تجربے کے باوجود مجبوری و بے بسی، عجز و ناتوانی اور ضعف و شکستگی کی تصویر بنے رہیں اور اپنا بچاؤ نہ کر سکیں۔

اس المناک حادثے اور اس میں ہونے والی ہلاکت و بربادی نے گزشتہ قوموں اور ملتوں کو پیش آنے والے ان واقعات کی تصدیق کر دی ہے جن کو قرآن مجید نے عبرت، تذکیر اور خدا کی قوت قاہرہ اور قانون مجازات کے اثبات کے لیے جا بجا بیان کیا ہے جن کو پہلے کے مرفہ الحال لوگوں کی

طرح آج کل کے ارباب خرد بھی قصہ وافسانہ کہہ کر جھٹلاتے اور مذاق اڑاتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ قوت واقتدار کے نشے میں اکڑنے اور اترانے والی کتنی بستیوں کی معیشت کا ساز وسامان ملیا میٹ کردیا گیا اور ان کے اجڑے گھر دوبارہ آباد نہیں ہوسکے، دوسری جگہ کہا ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی پاداش میں دھرلیا، کسی پر کنکر پتھر برسانے والی برفانی ہوائیں (حاصب) بھیجی، کسی کو گرج اور کڑک (رعد وبرق) نے دھرلیا، کوئی زمین میں دھنس گیا اور کوئی غرق آب ہوا، بعض اقوام کے نام لے کر جن کا نام ہی عربوں کی زبان میں امم بایدہ پڑ گیا مثلاً عاد، ثمود، اہل مدین اور قوم لوط وغیرہ، یہ سب تیز وتند خشک ہوا یا موسم سرما کی بادصرصر کڑک دمک، اولے، زلزلے اور سنگ گل کی بارش سے جب معدوم ہوئیں تو یا اکھڑے درختوں کی جڑوں اور تنوں کی طرح ڈھیر ہوگئیں یا اپنے گھروں میں اوندھے منھ پڑی کے پڑی رہ گئیں اور نہ اٹھ سکیں اور نہ اپنا بچاؤ کرسکیں اوران کے گھر اس طرح کھنڈر ہوئے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کبھی وہ آباد بھی تھے۔

یہ ساری قومیں اپنے زمانے میں نہایت متمدن اور شان وشوکت والی تھیں، ان کا بڑا رعب ودبدبہ بھی تھا مگر عذاب الٰہی کے سامنے ان کی دانائی، دانش مندی اور دوراندیشی ان کے کام نہیں آئی، آج کے ترقی یافتہ زمانے میں سائنس نے غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کی ہے مگر "فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ"، انسان کو جو اقتدار وتمکن اور تصرف وتسخیر دی گئی ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہیں کیا گیا اور اللہ کی بخشی نعمتوں اور صلاحیتوں کی قدر نہیں کی گئی تو اللہ کی گھات کے سامنے ساری ذہانت، تدبیر اور وسایل دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، یہ دنیا نہ بے مقصد ہے اور نہ اندھیر نگری ہے، اس کا خالق ومالک اسے نظام عدل وقسط کے ساتھ چلارہا ہے، خدا کی مقرر کردہ میزان سے کوئی چیز سرمو تجاوز نہیں کرسکتی، انسان کو بھی اس کا پابند بنایا گیا ہے اگر وہ اس سے تجاوز کرے گا اور اللہ کی دی ہوئی مہلت سے فایدہ نہ اٹھاکر بدعنوانی کرے گا، اس کے نظام حق وعدل میں خلل انداز ہوگا اور زمین میں شر وفساد برپا کرے گا تو اللہ کے قانون مکافات سے وہ نہیں بچ سکے گا، اہل ایمان کے لیے ان واقعات میں بڑا سبق پنہاں ہوتا ہے، یہ ان کی غفلت کے لیے ایک تنبیہ اور ایمان ویقین میں پختگی کا باعث بنتے ہیں، امتیاز رنگ ونسل اور تفریق ملل کے بہ جائے اسلام کا مقصود وحدت آدم ہے، اس لیے سارے مسلمانوں کو اپنے مظلوم اور بے سہارا بھائیوں کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے۔

☆☆☆

مقالات

"صدیق اکبرؓ"—ایک مطالعہ

از:- ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

یرموک کس کے عہد میں فتح ہوا؟ خلافت صدیقی کے عہد میں شام میں جو فتوحات ہوئیں ان سے متعلق شدید اختلافات ہیں، اس میں بھی اختلاف ہے کہ یرموک کا واقعہ عہد صدیقی میں پیش آیا یا خلافت فاروقی میں؟ طبری اور ابن اثیر یرموک کے اس واقعہ کو اجنادین سے پہلے مانتے ہیں لیکن ازدی، واقدی اور بلاذری کے ہاں سب سے بڑا معرکہ جو شام میں خلافت صدیقی میں ہوا ہے وہ اجنادین ہے، یرموک کا واقعہ ۱۵ھ میں پیش آیا۔

مولانا کی تحقیق میں واقعہ کی شکل یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی عراق سے روانگی سے قبل قیصر روم نے اپنی فوجیں واقوصہ میں جو یرموک سے متصل تھا جمع کردی تھیں، اسلامی اور رومی فوجیں آمنے سامنے تقریباً دو ماہ تک پڑی رہیں لیکن معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے حضرت خالدؓ عراق کا محاذ مثنی کے سپرد کرکے شام کے لیے روانہ ہوئے اور محسوس کیا کہ جنگی نقطہ نظر سے واقوصہ یا یرموک کو میدان جنگ بنانا مناسب نہیں ہے، اس لیے انہوں نے واقوصہ کے بہ جائے دمشق کا رخ کیا، اسلامی فوجیں وہاں سے ہٹیں تو رومیوں نے اجنادین میں مورچہ جمادیا، حضرت خالدؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ دمشق کا ارادہ ترک کرکے اجنادین پہنچ گئے اور سخت معرکے کے بعد کامیابی حاصل کی۔

مولانا نے واقعہ کی یہ شکل پیش کرکے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق پیدا کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یرموک میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صرف دونوں طرف کی فوجوں کا اجتماع ہوا، اس عہد میں شام میں سب سے بڑی جنگ اجنادین کی ہے، جن لوگوں نے واقوصہ میں افواج

کے اجتماع کو ہی جنگ یرموک سمجھ لیا ہے، انہوں نے یرموک کو اجنادین پر مقدم کر دیا ہے لیکن جن کی نظر اصل جنگ پر ہے، انہوں نے یرموک کے واقعہ کو ۱۵ھ کا واقعہ لکھا ہے۔ (ص ۲۸۵، ۲۸۶)

حضرت ابوبکرؓ کا روزینہ خلیفہ ہونے کے بعد قوم نے حضرت ابوبکرؓ کا جو روزینہ مقرر کر دیا تھا اس کی مقدار میں اختلاف ہے، ابن سعد نے یہ تمام روایتیں نقل کر دی ہیں، مولانا کی رائے میں ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ

"پہلے حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ دو ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا تھا لیکن جب وہ کافی نہیں ہوتا تھا تو اس میں اضافہ ہونے لگا اور ادھر فتوحات کے باعث اسلامی ریاست کی مالی حالت بھی بہتر ہوتی جا رہی تھی، اس بنا پر شدہ شدہ آپ کا وظیفہ چھ ہزار درہم سالانہ ہوگیا"۔ (ص ۴۶۶ و ۴۶۷)

حضرت ابوبکرؓ کی ذوالقصہ کو روانگی عبس و ذبیان وغیرہ غدار قبیلوں کو ان کی غداری کی سزا دے کر مسلمانوں کا انتقام لینے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے بہ نفسِ نفیس ایک فوج لے کر ذوالقصہ کی روانگی کا ارادہ کیا، صحابہ کرام نے بڑی منت و سماجت کی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ روانہ ہونے لگے تو حضرت علیؓ سواری کی باگ روک کر کھڑے ہوگئے اور بولے "میں آپ سے وہی کہوں گا جو آنحضرتؐ نے غزوۂ احد کے موقع پر آپ سے کہا تھا یعنی یہ کہ آپ اپنی تلوار میان میں کیجیے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر درد مند نہ کیجیے" لیکن سب کے جواب میں انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا اور میں اپنے نفس کے ساتھ تمہاری غم خواری قبول نہیں کر سکتا، چنانچہ اپنا لشکر لے کر ذوالقصہ روانہ ہوگئے اور قبایل کو شکست دے کر ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور عبس و بنو ذبیان نے جن مسلمانوں کو شہید کیا تھا ان کا انتقام لے کر فتح و کامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے مدینہ واپس آگئے۔

اس کے حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے کہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ کی درخواست قبول کر لی اور وہ خود واپس ہوگئے اور لشکر روانہ کر دیا، حالاں کہ طبری وغیرہ میں ہے کہ آپ نے یہ مشورہ منظور نہیں فرمایا اور بہ نفسِ نفیس تشریف لے گے۔ (ص ۱۷۷)

یہاں مولانا نے نہ دونوں روایتوں میں تطبیق دی اور نہ کسی کو ترجیح دی مگر فحوائے کلام سے

ظاہر ہے کہ وہ طبری وغیرہ کی رائے کو مرجح سمجھتے ہیں، ایک اور جگہ بنو تغلب پر حملے میں جو عورتیں گرفتار ہوئی تھیں ان ہی میں طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق ربیعہ بن بجیر تغلبی کی بیٹی بھی تھی لیکن بلاذری کے حوالے سے انہیں ربیعہ کے بہ جائے حبیب بن بجیر کی بیٹی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون ربیعہ بن بجیر کی بیٹی نہیں بلکہ بھتیجی تھی۔ (حاشیہ ص ۳۶۵)

قبایل اور شہروں کے ناموں اور بعض دوسرے امور کی تحقیق کے متعلق محققانہ و معلومات افزا حواشی سے بھی مصنف کی تلاش و جستجو اور تحقیق و محنت کا اندازا ہوتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ابن الدغنہ جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو ہجرت حبشہ کے موقع پر اپنی پناہ میں لیا تھا قبیلہ قارہ کے سردار تھے، مولانا قارہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"یہ بنو الہون بن خزیمہ کا قبیلہ ہے، تیراندازی میں ضرب المثل تھا، کہتے ہیں انصف القارۃ من راماھا یعنی جس نے قبیلہ قارہ کے ساتھ تیراندازی میں مقابلہ کیا اس نے اس کے ساتھ انصاف کیا، بحوالہ النہایہ لابن الاثیر"۔ (حاشیہ ص ۸)

ثنیۃ العقاب کے متعلق لکھتے ہیں "عقاب حضرت خالد کے علم کا نام تھا، آپ نے اس جگہ پہنچ کر یہ علم نصب کیا تھا، اس لیے اس جگہ کا نام ثنیۃ العقاب ہوگیا"۔ (حاشیہ ص ۲۸۱)

حدیقۃ الموت کے متعلق عام محدثین و مورخین کا خیال یہ بتایا ہے کہ مسیلمہ سے جنگ یمامہ میں لڑی گئی اور حدیقۃ الموت جس میں مسیلمہ قتل ہوا تھا، اس کی نسبت یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ یمامہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی تھا لیکن مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے ثابت کیا ہے کہ مسیلمہ کا باغ یمامہ میں نہیں بلکہ مقام ہجر میں تھا۔ (ص ۲۲۱، ۲۲۲)

اسی طرح مالک بن نویرہ کا مختصر حال تحریر کیا۔ (ص ۲۰۰)

ابلہ کے متعلق یہ نوٹ تحریر کیا کہ "یہ مقام دجلۂ بصرہ کے کنارے پر خلیج فارس کے کونہ میں جو شہر بصرہ تک آتا ہے واقع ہے اور بصرہ چوں کہ حضرت عمرؓ فاروق کے عہد میں آباد ہوا ہے اس لیے اس سے مقدم ہے"۔ (ص ۲۴۴)

مورخین کے رجحان کے مطابق عراق میں پہلی جنگ جو لڑی گئی وہ غزوۂ حفیر یا ذات السلاسل کے نام سے مشہور ہے، حفیر خلیج فارس کے قریب اور کاظمہ کی سرحد پر واقع ہے، مدینہ سے بصرہ تک

اگر ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو حفیر اسی خط پر بصرہ سے پہلے واقع ہوگا، اس مقام کا حاکم ہرمز تھا جو حکومت ایران کے ماتحت تھا...... (ص ۲۴۵)

بعض غلط خیالات کی اصلاح و تصحیح

حضرت ابوبکرؓ کو عتیق کہے جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طبری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ تین بھائی تھے اور ان کے نام عتیق، معتق اور معیتق تھے لیکن اصل یہ ہے کہ عتیق نام نہیں بلکہ لقب تھا، ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے ان کو دیکھا تو فرمایا انت عتیق اللہ من النار (ترمذی ج ۲، ص ۲۱۴) تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد ہو، اسی وقت سے ان کا لقب عتیق پڑ گیا، اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ سے بھی صاف تصریح ہے کہ عتیق آپ کا لقب ہی تھا۔ (ص ۲)

عام تاریخوں میں اور بعض روایات میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی رائے کے مطابق آنحضرتؐ کا اسیران بدر کو زر فدیہ لے کر آزاد کردینا اور انہیں قتل نہ کرنا بارگاہ ایزدی میں پسندیدہ نہیں ہوا اور اس پر یہ آیت بہ طور عتاب نازل ہوئی:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ — اگر خدا کا لکھا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو کچھ

فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال) — تم نے لیا اس پر تم کو بڑا عذاب ہوتا۔

مولانا سعید احمد صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آیت عذاب الٰہی پر دلالت کرتی ہے لیکن عتاب کا سبب قیدیوں کو قتل نہ کرنا اور زر فدیہ لے کر ان کو رہا کردینا نہیں بلکہ مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہوجانا ہے، درآں حالیکہ اب تک مال غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ (ص ۳۷)

مرض الموت میں رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ اس حکم کے مطابق وہ تین دن تک نماز پڑھاتے رہے لیکن ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ کی حیات میں تین مرتبہ نماز پڑھائی، مولانا سعید احمد صاحب نے خود ابن سعد ہی کے حوالے سے اس میں یہ تصحیح و تطبیق دی ہے۔

لیکن اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن سعد خود ہی فرماتے ہیں کہ "ان تین نمازوں سے وہ نمازیں مراد ہیں جن میں آنحضرتؐ نے خود حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی ورنہ یوں تو انہوں نے سترہ مرتبہ نماز پڑھائی"۔ (حاشیہ ص ۵۹)

حضرت ابوبکرؓ سے بیعت میں حضرت علیؓ کی تاخیر کے متعلق جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں جب تک قرآن کو جمع نہیں کرلوں گا گھر سے نہیں نکلوں گا، بعض حضرات نے اس جمع قرآن کو حضرت علیؓ کی طرف سے بیعت نہ کرنے کا عذر بتایا ہے لیکن مولانا سعید احمد فرماتے ہیں کہ اگر یہ کوئی عذر ہے بھی تو عذر بارد ہے، چند منٹ کے لیے بیعت کے واسطے آجانا جمع قرآن کے کام میں کیوں کر خلل انداز ہوسکتا تھا۔ (حاشیہ ص ۴۷)

بعض غلط روایتوں کی بڑی شد و مد سے مدلل تردید کرکے اسے جعلی اور اضافہ قرار دیا ہے، مثلاً ایک روایت ہے کہ خریم بن اوس طائی نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ سے عرض کیا تھا کہ اگر اللہ آپ کے ہاتھوں حیرہ فتح کرادے تو آپ بنت بقیلہ (حیرہ کے ایک نام ور خاندان کی لڑکی) مجھ کو عطا فرمائیے گا، جب حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے صلح کرنی چاہی تو خریم نے ان سے کہا کہ بنت بقیلہ کو آپ صلح میں داخل نہ کریں کیوں کہ رسول اللہؐ اس کو مجھے دے چکے ہیں، خریم کے اس دعوی کی تصدیق بشیر بن سعد اور محمد بن مسلمہ نے بھی کردی تو حضرت خالدؓ نے اس عورت کو صلح میں شامل نہیں کیا اور وہ خریم کے حوالے کردی لیکن چوں کہ یہ عورت اس وقت ۸۰ برس کی بڑھیا تھی اس لیے خریم نے اس عورت کے اہل خاندان سے ایک ہزار درہم لے کر اسے ان کو واپس کردیا، جب لوگوں نے خریم سے کہا یہ آپ نے کیا کیا کہ بنت بقیلہ کو اتنے سستے داموں فروخت کردیا تو خریم نے جواب دیا کہ "مجھ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار سے اوپر بھی کوئی عدد اور ہے"۔

مولانا نے فتوح البلدان بلاذری سے یہ روایت نقل کی ہے اور بتایا ہے کہ طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر جیسے مورخین تک نے بھی اسے نقل کیا ہے مگر ان کے نزدیک یہ ایک غلط افسانہ ہے اور روایت اصول روایت کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور درایتاً بھی، ان کے دلائل ملاحظہ ہوں:

۱- اس میں ہی اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کس شخص کا ہے، بلاذری نے قبیلہ بنو طے کے خریم بن اوس کا بتایا ہے لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص سے کیا تھا، ابن کثیر، ابن اثیر اور طبری نے اس شخص کا نام شویل لکھا ہے۔

۲-طبری نے اس عورت کا نام کرامہ اور حافظ ابن حجرؒ نے یشیما لکھا ہے۔

۳-طبری میں ہے کہ رسول اللہؐ نے بنت بقیلہ کو دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ حیرہ بہ زورِ شمشیر (عنوۃ) فتح ہو لیکن جب وہ صلحاً فتح ہوا تو نہ خریم کو اس کے طلب کرنے کا حق تھا اور نہ حضرت خالدؓ اس مطالبہ کو منظور کر سکتے تھے۔

۴-حضرت خالدؓ نے بنت بقیلہ کو شرائط صلح سے مستثنیٰ اور مدعی کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا تو بنت بقیلہ کے رشتہ دار معترض ہوئے لیکن بنت بقیلہ نے کہا، آپ لوگ مجھے جانے دیں، اس شخص نے مجھ کو جوانی میں دیکھا تھا اور شاید یہ سمجھتا ہے کہ جوانی ہمیشہ رہتی ہے، اسی برس کی بڑھیا دیکھ کر خود ہی واپس کر دے گا، سوال یہ ہے کہ اگر بنت بقیلہ کو عہد شباب میں دیکھ کر یہ شخص دل دے بیٹھا تھا تو اس وقت خود بھی جوان رہا ہوگا پھر یہ کیا بات ہے کہ اس عرصہ میں بنت بقیلہ تو شباب اور کہولت کی منزلیں طے کر کے ہشتاد سالہ عجوزہ بن گئی لیکن یہ شخص جوان ہی رہا جو اس جذبہ کے ساتھ اس کو حضرت خالدؓ سے طلب کرتا ہے اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس شخص کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ اس مدت میں بنت بقیلہ بڑھیا ہو چکی ہوگی، وہ اس کے متعلق یہ کہتی ضرور ہے کہ وہ شباب کو پائیدار اور دوامی سمجھتا ہے لیکن کیا درحقیقت دنیا میں ایسا کوئی احمق ہے بھی۔

۵-اس شخص کو جب لوگوں نے سستے داموں بیچ دینے پر برا بھلا کہا تو اس نے کہا کہ میں ایک ہزار کے بعد بھی کوئی عدد ہے یہ جانتا ہی نہیں تھا، اس بات کو بھی آخر کون باور کر سکتا ہے، حضرت خالدؓ کی فوج میں کتنے مسلمان تھے؟ مال غنیمت کس کثیر مقدار اور تعداد میں مسلمانوں کے ہاتھ پڑ رہا تھا؟ کیا یہ سب چیزیں اس شخص کو معلوم نہیں تھیں اور اگر تھیں تو وہ ان کا شمار کس طرح کرتا تھا۔ (ص ۲۵۵ تا ۲۵۷)

ایک اور غلط روایت پر مولانا کی محققانہ بحث ملاحظہ ہو:

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خمس میں سے رسول اللہؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا تھا اور صرف تین حصے باقی رکھے تھے، مولانا اس روایت کو لغو اور غلط قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس کا راوی محمد بن سائب

کلبی محدثین کے نزدیک مجروح اور ناقابل اعتبار ہے، سفیان ثوری کا قول ہے "کلبی سے بچو" لوگوں نے کہا پھر آپ اس سے کیوں روایت کرتے ہیں؟ فرمایا میں اس کے جھوٹ سچ کی پرکھ رکھتا ہوں، یزید بن زریع نے ایک مرتبہ کلبی سے کوئی روایت نقل کی تو ساتھ ہی فرمایا کہ کلبی سبائی تھا، حضرت اعمش نے یہ سن کر کہا کہ سبائیوں سے بچنا چاہیے، میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، لوگ ان کو کذاب کہتے ہیں۔

روایت زیر بحث کی اسناد ہے عن ابی صالح عن ابن عباس اور کلبی کی اس خاص اسناد کے متعلق ائمہ حدیث کا اتفاق ہے کہ اس اسناد سے جو روایت ہوگی وہ جھوٹی ہوگی خود سفیان فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مرتبہ کلبی نے کہا تھا کہ میں ابوصالح سے جو روایت بھی کروں گا وہ جھوٹی ہوگی، ابن عدی کا قول ہے "حدیث کے سلسلے میں کلبی سے بہت سی منکر احادیث مروی ہیں اور خاص طور پر وہ روایت جو ابن عباس سے بواسطہ ابوصالح مروی ہو"۔

حدیث کے علاوہ اس شخص کا تفسیر میں بھی یہی حال تھا، کسی نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا، کیا محمد بن سائب کلبی کی تفسیر دیکھنا جائز ہے، فرمایا نہیں۔ (ص ۳۴۹، ۳۵۰)

مولانا نے مورخین اور ارباب سیر کے بیان کی بے ترتیبی، پیچیدگی، الجھاؤ اور عدم تسلسل نیز کسی واقعے کو مناسب موقع ومحل پر درج نہ کرنے کی شکایت کی ہے، اس سے تاریخ نگاری کے بلند مذاق اور اچھے سلیقۂ تحریر وتصنیف کا پتا چلتا ہے جیسے فتوحات شام کے بیان کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"شام کی فتوحات سے متعلق مورخین کے بیانات بڑے مختلف اور پیچیدہ ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے پہلا لشکر کب بھیجا اور وہ لشکر کون سا تھا؟ ان لشکروں کے امرا کون کون تھے؟ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب ایک نہیں ہے، طبری میں متعدد روایات ہیں جن سے متعدد باتیں معلوم ہوتی ہیں، بلاذری کے بیانات بہت بے ترتیب اور الجھے ہوئے ہیں جن سے ایک شخص کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتا، ان میں سے بعض بیانات طبری کی روایتوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور بعض ان کی بالکل ضد ہیں، ابواسماعیل الازدی اور واقدی کے بیانات کا حال بھی یہی ہے، ابن اثیر، ابن خلدون اور عمادالدین بن کثیر

نے زیادہ تر طبری کی روایات کا ہی تتبع کیا ہے لیکن ہم نے ان سب مآخذ کو سامنے رکھ کر
واقعات شام کو ایک خاص طرز پر مرتب کیا ہے جس سے واقعات میں تاریخی تسلسل بھی
باقی رہتا ہے اور منطقی ترتیب بھی قایم رہتی ہے'' ۔(ص ۲۶۸)

ایک مرتبہ عید کے دن حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس دولڑکیاں ہیں جو گانا نہیں جانتی تھیں لیکن لشم پشتم ایک گیت گا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ سے چپ نہ رہا گیا بولے ''ارے رسول اللہؐ کے گھر میں یہ شیطانی گانے'' آنحضرتؐ منہ پھیرے لیٹے تھے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ کہتے سنا تو فرمایا ''اے ابوبکر! ہر قوم کی عید ہوتی ہے، آج یہ ہماری عید ہے''، مولانا سعید احمد صاحب لکھتے ہیں:

''بعض مصنفین نے اس واقعہ کو حضرت ابوبکرؓ کے تقوی کے واقعات کے
ماتحت درج کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اگر تقوی کی بات ہوتی تو اس کا خیال آنحضرتؐ
سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا تھا، اصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس چیز کو ادب واحترام
کے خلاف سمجھتے تھے اور اسی لیے انہوں نے اس پر سخت الفاظ میں ناگواری خاطر کا اظہار
کیا تھا'' ۔(ص ۴۴۷، ۴۴۸)

مولانا نے خود ''ادب واحترام نبویؐ'' کے عنوان کے تحت اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

مستشرقین کے خیالات بھی کہیں کہیں زیر بحث آئے ہیں اور ان کی مدلل تردید وتغلیط کی گئی ہے، فتنہ ارتداد وبغاوت کا استیصال جس تیزی اور قوت کے ساتھ ہوا ہے یعنی ایک برس سے بھی کم مدت میں، اس پر مستشرقین کو سخت حیرت ہے، چنانچہ کیتانی کا خیال ہے کہ ان تمام جنگوں سے فراغت ایک سال میں نہیں بلکہ دوسال میں ہوئی ہوگی، مولانا سعید احمد صاحب فرماتے ہیں:

''تمام مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۲ھ کے آغاز میں حضرت ابوبکرؓ نے شام وعراق
کی مہم شروع کردی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اندرون عرب استحکام واستقلال حاصل کیے
بغیر وہ کسی اور طرف توجہ کرتے، اصل یہ ہے کہ حروب ارتداد کا ایک طویل سلسلہ، وسیع و
عریض محاذ جنگ اور عرب قبایل کا تمرد وسرکشی، ان سب چیزوں کی وجہ سے کیتانی اور
اس کے ہم خیال مستشرقین کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس محاذ جنگ کا قطعی فیصلہ ایک

برس کی قلیل مدت میں کیوں کر ہوگیا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ فتوحات عراق وشام کا
سلسلہ بھی تو کافی دراز اور وسیع ہے اور پھر یہاں تو مقابلہ رومی وایرانی اس وقت کی دو
عظیم الشان سلطنتوں سے تھا، پس اگر حروب ارتداد کی انجام دہی میں دو برس لگے تو اس
حساب سے عراق وشام میں بھی کم از کم دو ہی برس لگنے چاہئیں، حالاں کہ حضرت ابوبکرؓ
کی مدت خلافت ہی کل سوا دو برس ہے اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ حروب ارتداد
کے ساتھ فتوحات عراق وشام کی مہم بھی جاری ہو، پروفیسر فلپ ہٹی کی رائے میں ان تمام
اندرونی لڑائیوں کا خاتمہ صرف چھ مہینہ کی قلیل مدت میں ہی ہوگیا تھا'' ۔(ص ۲۳۳)

مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمان درحقیقت حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایران اور روم دو طاقت ور دشمنوں کے نرغے میں تھے جو اسلام کے لیے مستقل خطرہ اور عربی قومیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے، اس بنا پر ان کی سرکوبی نہ کی جاتی تو نہ اسلام کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع مل سکتا تھا نہ عربی قومیت مستحکم ہوسکتی تھی اور نہ عراق اور شام کے عرب قبایل کو ان دونوں حکومتوں کی غلامی اور ان کے حقارت آمیز برتاؤ سے نجات مل سکتی تھی، اس توجیہ سے وہ کہتے ہیں:

''ان یورپین مصنفین کی بھی تردید ہوتی ہے جو عراق وشام پر اسلامی لشکر کی
پیش قدمی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چوں کہ عرب طبعاً جنگ جو تھے اور حروب ارتداد
سے فارغ ہونے کے بعد اندیشہ تھا کہ پھر کہیں اور کسی طرف سے بغاوت کا شعلہ نہ
بھڑک اٹھے، اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے ان کو مشغول رکھنے کے لیے ان کا رخ ان
ملکوں کی طرف پھیر دیا، واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ اقدام صرف اسی غرض سے تھا تو اس میں
کوئی جان نہ تھی اور اس صورت میں مسلمان ہرگز اس لائق نہیں ہوسکتے تھے کہ وہ دنیا
کی دو عظیم الشان طاقتوں سے بہ یک وقت ٹکرا سکتے ...... انصاف پسند یورپین مصنفین
نے خود اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ فتوحات کسی دنیوی لالچ اور طمع کا نتیجہ نہیں بلکہ
اس اسپرٹ، بے خوفی اور بے جگری اور اس ڈسپلن کا نتیجہ تھیں جو اسلام نے ان کے
اندر پیدا کردیا تھا'' ۔(ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

آگے یورپ کے بعض انصاف پسند مورخین کے اعترافات نقل کیے گئے ہیں۔

فتوحات عراق و شام کے اسباب بیان کرتے ہوئے پہلے مغربی مصنفین نے اپنے مذاق کے مطابق جو لکھا ہے ان میں سے کچھ کو نقل کر کے ان کی تردید کی ہے لیکن ایک انصاف پسند کی طرح ان کے بعض تجزیوں کی تحسین بھی کی ہے، اسی سلسلے میں خود مسلمان مصنفین اور خاص طور پر قدیم طرز تعلیم کے حامل حضرات کا یہ خاصہ بتا کر اس کی تغلیط کی ہے کہ ''اگر کوئی مغربی مصنف مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی میں کسی اقتصادی اور معاشی وجہ کو دخیل مانتا ہے تو وہ چڑھ سے جاتے ہیں حالاں کہ خود صحابہ کے طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ نو آبادکاری میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونے میں اقتصادی وجوہ کو بڑا دخل ہوتا تھا''۔ (ص ۲۹۴)

بعض جگہ مولانا اصل ماخذ کی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے ہیں، طائف کے محاصرے کے دوران رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے اپنے اس خواب کا ذکر کیا کہ کسی نے مجھ کو ایک لبالب پیالہ نذر کیا لیکن ایک مرغے نے اس میں ٹھونگ ماردی اور جو کچھ پیالہ میں تھا وہ گر پڑا، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا ''اس خواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس محاصرے میں کامیابی نہیں ہوگی''، ارشاد ہوا ''ہاں! میں بھی یہی سمجھتا ہوں''، مولانا نے طبری سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے:

> ''کتاب میں غلطی سے آنحضرتؐ کا جواب وانا لا أری ذلک چھپ گیا ہے جس کے معنی ''میں ایسا نہیں سمجھتا'' ہیں حالاں کہ درحقیقت یہ لأری ہے جس کے معنی تاکید کے ساتھ اثبات کے ہیں، چنانچہ سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اس کو اسی طرح پڑھا ہے، دیکھو ازالۃ الخفا، ج ۲، ص ۱۶''۔ (ص ۵۰)

اس سے مولانا کی عربیت کے پختہ ذوق کا اندازا ہوتا ہے، عربیت میں بلند پایگی اور بلاغت شناسی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، حضرت ابوبکرؓ کے بڑے بیٹے عبدالرحمن غزوۂ بدر تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قریش کی فوج کے ایک سپاہی وہ بھی تھے، انہوں نے میدان جنگ میں بڑھ کر پکارا کہ میرے مقابلے میں کون آتا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ خود تلوار کھینچ کر مقابلہ کو نکلے لیکن رحمت عالمؐ کو یہ گوارا نہ ہوا فوراً حضرت ابوبکرؓ کو روکا اور فرمایا:

متعنی بنفسک — تم یہیں میرے پاس رہ کر مجھ کو فائدہ پہنچاؤ۔

مولانا اس ارشاد نبویؐ کی بلاغت کی طرف یہ لکھ کر توجہ دلاتے ہیں:

> ''ذرا نطق مبارک کی بلاغت پر غور کرو، آنحضرتؐ کا اصل مقصد حضرت ابوبکرؓ کو بیٹے کے مقابلے میں جانے سے روکنا تھا لیکن چوں کہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے جوش حمایت میں جا رہے تھے اس لیے ممکن تھا کہ اگر صرف سادہ طریقہ پر حضور پرنورؐ ان کو اس سے روکتے اور یہ فرماتے کہ نہیں تم یہیں رہو تو ان پر اثر نہ ہوتا یا ہوتا مگر وہ بددلی محسوس کرتے، اس لیے آپؐ نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک خود بہت اہم تھی یعنی حضورؐ کے پاس ہی رہ کر آپؐ کی حفاظت کرنا، اس لیے آپؐ نے متعنی بنفسک جس کے لفظی معنی ہیں ''تم اپنی ذات سے مجھ کو فائدہ پہنچاتے رہو''۔ (حاشیہ ص ۳۶)

اسباب و وجوہ اور اسرار و مصالح کی وضاحت

مولانا نے جا بہ جا وجوہ و اسباب اور اسرار و مصالح پر بھی بحث کی ہے، حضرت ابوبکرؓ کا لقب عتیق پڑنے کا سبب پہلے بیان ہو چکا ہے، ان کا دوسرا لقب صدیق تھا، بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا لیکن جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے اس کی زیادہ صحیح وجہ یہ ہے کہ معراج کے واقعے کی انہوں نے تصدیق کی تھی۔ (ص ۳)

ہجرت حبشہ کے بیان میں اس کے حکم و مصالح پر بھی اچھی بحث کی ہے، لکھتے ہیں ''ہجرت کا یہ حکم اس لیے نہیں تھا کہ سرفروشانِ اسلام میں قریش کے مظالم کو سہنے کی طاقت نہیں رہی تھی بلکہ اس میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس بہانے اسلام کی دعوت دوسرے ملکوں میں پھیلے گی اور غالباً اسی وجہ سے مہاجرین کی فہرست میں ان ناموران قریش کے نام نظر آتے ہیں جو اپنی شخصیت، طرز گفتگو اور عقل و فہم سے اسلام کی تبلیغ کا حق ادا کر سکتے تھے، دوسری حکمت یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو یہ سبق دینا تھا کہ مسلمانوں پر اگر کہیں اس قدر ظلم کیا جائے کہ ان کو خدا کا نام لینے تک کی اجازت نہ ہو تو پھر بھی مسلمانوں کو وہیں نہ پڑا رہنا چاہیے بلکہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری محفوظ جگہ میں اپنی تنظیم کرنی اور قوت بڑھانی چاہیے''۔ (حاشیہ ص ۸)

اسی طرح عہد صدیقی میں جو مقامات فتح ہوئے ان کی اہمیت کے اسباب و وجوہ بتائے گئے ہیں، بحرین کے متعلق لکھتے ہیں:

''بعض خاص اعتبارات سے یہ جنگ یمامہ سے بھی زیادہ اہم تھی، یمامہ میں صرف ایک قوم اور ایک گروہ سے واسطہ تھا لیکن بحرین چوں کہ خلیج فارس پر واقع تھا، ایران کی حکومت کے ماتحت تھا اور یہاں ہندوستان اور ایران کے تاجر آباد تھے، جنھوں نے فرات کے دہانے سے عدن تک اپنی آبادیاں قایم کر رکھی تھیں، اس بنا پر اسلام کی یہ جنگ صرف کسی ایک قوم سے نہیں تھی بلکہ بین الاقوامی تھی اور پھر چوں کہ ان لوگوں میں عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی، آتش پرست بھی تھے اور بت پرست بھی، اس لیے اس جنگ کو بین المذاہبی جنگ بھی کہہ سکتے ہیں، اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شان دار فتح ہوئی اور اثرات و نتایج کے علاوہ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرق میں ایرانی حکومت نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تار و پود بکھر گیا اور مسلمانوں کے لیے عراق کی فتح کا راستہ کھل گیا''۔ (ص ۲۲۶)

اسی طرح جنگ یمامہ وغیرہ کی اہمیت کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

کتاب کا یہ مطالعہ و تجزیہ بہت طویل ہو گیا مگر حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا، گوناگوں خوبیوں کو سمیٹ کر احاطۂ تحریر میں لانا بہت مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مگر کسی مصنف کی ہر تحقیق و رائے سے اتفاق ضروری نہیں، اس لیے اب اس رخ کے بھی بعض جلوے دکھائے جاتے ہیں:۔

مولانا نے آنحضرتؐ سے حضرت ابوبکرؓ کی دوستی کے زیر عنوان لکھا ہے:

''حافظ ابن حجرؒ نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ ابوبکرؓ تو رسول اللہؐ پر بحیرا راہب کے واقعہ کے بعد سے ہی ایمان لے آئے تھے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً حضرت ابوبکرؓ بھی سفر شام میں آنحضرتؐ کے ہم راہ تھے''۔ (ص ۴)

اس کے لیے مولانا نے اصابہ جلد ۲ حرف عین کا حوالہ دیا ہے مگر تلاش کے باوجود یہ ہم کو اس وقت **نہیں مل سکا** ....، رہا بحیرا راہب کا واقعہ تو یہ محققین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے اور جب رسول اللہؐ کی دعوت کا آغاز ہی اس وقت نہیں ہوا تھا اور سفر شام کے وقت آپؐ کی عمر تقریباً بارہ برس تھی اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ سے بھی دو برس چھوٹے تھے تو اس وقت ان کے ایمان لانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، اس سفر میں حضرت ابوبکرؓ اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت بلالؓ کی ہم راہی بھی بالکل غیر محقق اور خلاف واقعہ امر ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبول اسلام کا تذکرہ کیا ہے، اس میں یہ بحث بھی کی ہے کہ سب سے پہلے کون اسلام لایا جس میں ایک خیال یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ کا اسلام حضرت ابوبکرؓ کے اسلام پر بھی مقدم ہے، یہ بحث ہمارے خیال میں غیر تشفی بخش ہے اور تعدد اقوال اور روایات کے الجھاؤ کی وجہ سے مولانا اپنا کوئی متعین خیال ظاہر نہیں کر سکے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا استحقاق خلافت کے عنوان سے جو باب قایم کیا گیا ہے، اس کی ایک ذیلی سرخی ''حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر قرآن مجید میں'' ہے، اس میں لکھا ہے کہ ''تمام صحابہ کرام میں سب سے زیادہ یہ شرف اور سعادت حضرت ابوبکرؓ کو ہی حاصل ہے کہ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلق کو، آپ کے خاص خاص اعمال کو جن سے اسلام کو بڑا فایدہ پہنچا اور آپ کے عہد خلافت کے بعض نہایت شان دار کارناموں کو پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان پر مدح بھی کی ہے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کا قبل از بعثت جو دوستانہ تعلق تھا اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے''۔ (ص ۱۱۲)

ہمارے خیال میں یہ ساری باتیں غیر محقق ہیں اور مولانا نے اپنے دعوی کے ثبوت میں جو آیات نقل کی ہیں، ان میں سے بجز دو ایک کے کوئی حضرت ابوبکرؓ کے حق میں صریح و واضح نہیں ہیں، مفسرین شان نزول کے معاملے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں، رہیں تفسیری روایات تو مولانا نے واقعاتی حدیثوں کے قبول کے معاملے میں جو اصول بیان کیا ہے، ان کو ان آیات کے سلسلے میں مدنظر نہیں رکھا ہے اور نہ امام احمدؒ کے اس قول پر توجہ دی کہ ثلاثۃ کتب لا اصل لھا الخ۔

کتاب کا سب سے نازک مبحث حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت، خیبر اور باغ فدک کے مسئلے میں حضرت فاطمہؓ کی آزردگی ہے، جس پر مولانا نے کئی جگہ بحث کی ہے، اولاً تو اس پر ایک ہی جگہ مفصل بحث ہونی چاہیے تھی اور دوسرے ناگزیر مقامات پر محض اسی کا حوالہ دے دینا کافی تھا، دوسرے ان کی یہ بحثیں پڑھ کر وہ مشہور مصرعہ یاد آجاتا ہے کہ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا یہاں اس مسئلے پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہم دو تین امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ کے چھ ماہ تک بیعت نہ کرنے اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد بیعت کرنے کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں بھی ہے، مولانا نے اس پر درایتاً اور روایتاً متعدد اشکالات وارد کرکے مستدرک حاکم سے دو روایتیں نقل کی ہیں جن کے متعلق حاکم نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ صحیحین کی شرط پر ہیں لیکن شیخین نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، حاکم نے تو اپنی اکثر حدیثوں کے بارے میں یہی کہا ہے مگر اس کے باوجود اس میں ضعاف بلکہ موضوع حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

مولانا صحیحین کا مرتبہ کتب حدیث میں سب سے اونچا مانتے ہیں مگر اس کے باوجود اس کو بھی ملحوظ رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں:

"یہ حکم بہ حیثیت مجموعی اور اکثریت کے اعتبار سے ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحیحین کی ہر روایت دوسری کتب حدیث کی ہر روایت سے زیادہ صحیح ہے، وجوہ قبول اگر غیر صحیحین کی روایت کے ساتھ زیادہ ہوں تو بے شک اس کو ترجیح ہونی چاہیے"۔ (مقدمہ ص۲۲)

بلاشبہ یہ متاخرین حنفیہ کا مذہب ضرور ہے، انہوں نے یہ دیکھ کر کہ صحیحین کی مرویات کی زد ان کے مذہب پر پڑ رہی ہے تو انہوں نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کردیے کہ صحیحین کی ترجیح محض ان کی شروط کی وجہ سے ہے پس اگر کسی دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر اتر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہوجائے گی مگر محقق محدثین اس کو درست نہیں سمجھتے، صحیحین کی ترجیح کی اصل وجہ شہرت اور قبول ہے۔

مولانا کے خیال میں مسئلہ زیر بحث میں وجوہ قبول صحیحین کی بہ جائے غیر صحیحین یعنی مستدرک حاکم کی روایت کے ساتھ زیادہ ہیں اور غالباً زیادہ اس لیے ہیں کہ اس سے وہ سارے

اشکالات رفع ہوجاتے ہیں جو انہوں نے وارد کیے تھے مگر ہمارے خیال میں اس کے باوجود بھی وہ باقی رہ جاتے ہیں، مولانا نے مستدرک کی روایت کے پیش نظر واقعہ کی صورت یہ تحریر فرمائی ہے۔

صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ بیعت کی ہے، پہلی بیعت بیعت خلافت ہے جو آنحضرتؐ کی وفات کے دوسرے ہی دن مسجد نبویؐ میں بیعت عامہ کے موقع پر کی گئی اور دوسری بیعت بیعت رضا ہے جو آپ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد کی ہے، اس بیعت کا مقصد آپس میں صلح صفائی کرنا اور باہمی تعلقات کو پھر از سر نو خوش گوار کرلینا تھا۔

گویا صلح صفائی پہلی بیعت کرنے کے بعد نہیں ہوسکی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری اور مستدرک دونوں کی روایتوں میں موجود ہے اور چھ ماہ کا عرصہ کشیدگی اور کبیدگی میں گزرا تو نتیجے کے لحاظ سے یہ اشکال کہ "کیا یہ چیز حضرت علیؓ کی بے نفس اور پاک باز و پاک طینت شخصیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے"، نہیں رفع ہوا چاہے بیعت ایک ہو یا دو، مولانا کا ایک اشکال یہ بھی ہے کہ "اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مدت میں جو اہم واقعات و حوادث پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھے، حضرت علیؓ ان سب سے بے تعلق رہے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟" ہم کو اس سلسلے میں یہی عرض کرنا ہے کہ چاہے حضرت علیؓ نے ایک دفعہ بیعت کی ہو یا دو دفعہ روایات سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اس عرصے میں الگ تھلگ ہی رہے بلکہ دو دفعہ بیعت کرنے کی صورت میں مولانا کا اشکال اور قوی ہوجاتا ہے کہ دونوں میں شکر رنجی بھی رہی اور حضرت علیؓ الگ تھلگ بھی رہے، اسی لیے تو دوسری بیعت کی ضرورت پیش آئی۔

جب ایک بیعت ہوچکی تھی تو پھر دوسری بیعت کے کیا معنی؟ یہ تو مضحکہ خیز بات ہوئی۔

صحیح بخاری کی روایت چوں کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اس لیے مولانا نے پہلا سوال یہ قایم کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے تعلقات کس قسم کے تھے؟ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے، مولانا کے اصول کے مطابق چوں کہ راوی (عائشہؓ) کے تعلقات

صاحب واقعہ (علیؓ) سے اچھے نہیں تھے، اس لیے ان کی روایت بے اعتبار قرار پائے گی، حضرت عائشہؓ کا درجہ و مرتبہ نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کیا مولانا ہی کے الفاظ میں حضرت علیؓ کی بے نفس اور پاک باز و پاک طینت شخصیت کے یہ شایان شان ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ سے اپنے تعلقات خراب رکھیں۔

مولانا روایات کی تحیص و تنقیح کرتے ہوئے ایک جگہ طبری اور یعقوبی جیسے مورخین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے اپنی پرانی عصبیت کی بنا پر اس وقت غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر کے حضرت علیؓ کو مشتعل کرنا چاہا تو آپ نے سختی کے ساتھ ان کو ڈانٹ دیا، چنانچہ ایک مرتبہ ابوسفیانؓ نے حضرت علیؓ کو عار دلائی اور ان کو حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت پر برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہا یہ دیکھیے قریش میں جو گھٹیا درجہ کا قبیلہ ہے خلافت اس میں چلی گئی، خدا کی قسم اگر آپ اس کے خواہاں ہوں تو میں مدینہ کو سوار اور پا پیادہ فوج سے بھر دوں گا، حضرت علیؓ یہ سنتے ہی برہم ہو گئے اور بگڑ کر فرمایا، اے سفیان! تم اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن ہو، تم ایسی باتوں سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، ہم نے ابوبکرؓ کو خلافت کا اہل پایا ہے''۔

ایک اور روایت میں تو یہاں تک ہے کہ

''ابوسفیان نے حضرت علیؓ سے کہا، اپنا ہاتھ پھیلائیے تا کہ میں آپ سے بیعت کر لوں لیکن حضرت علیؓ نے شدت کے ساتھ انکار فرمایا اور ابوسفیان کو جھڑک دیا''۔ (ص ۷۲و۷۳)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ بنو امیہ میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جن کا آئینہ قلب گرد کدورت سے صاف نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے وہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے تھے، عام مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا ہوگا اور اس سے بدگمانیاں پیدا ہوں گی، یہی وہ بدگمانیاں ہیں جن کا اثر روایات میں ظاہر ہے، ایک نکتہ شناس نفسیات معلوم کر سکتا ہے کہ ان روایات میں کتنی بات واقعی ہے اور کتنی وہ ہے جو اس طرح کی عام بدگمانیوں

کے زیر اثر راوی کا اپنا اضافہ اور خود اس کے اپنے احساس یا قیاس کا نتیجہ ہے''۔ (ص ۴۴۹)

حضرت ابوسفیان کے متعلق جو روایتیں نقل کی گئی ہیں وہ طبری اور یعقوبی کے حوالے سے ہیں، ان سے صرف حضرت ابوسفیان ہی کی شخصیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ خود حضرت علیؓ کے بارے میں بھی شک ہوتا ہے کہ ان کے احساسات کیا تھے؟ جن کی بنا پر ابوسفیان یا لگائی بجھائی کرنے والوں کو اس طرح کی باتیں کہنے کا حوصلہ ہوتا تھا اور بنو امیہ ہی پر موقوف نہیں ہے، بنو ہاشم میں بھی کچھ لوگ ایسے رہے ہوں گے۔

اہل سنت کے علما و محققین کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ ان کے نزدیک نہ بنوامیہ کے گناہ باوجود اسلام یھدم ما کان قبلہ کے دھلے اور نہ ابوسفیان و امیر معاویہ طلقا کے زمرے سے نکل سکے، اس بحث کے آخر میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہی قول فیصل ہے، ملاحظہ ہو:

''حضرت علیؓ حضرت صدیق اکبرؓ سے بیعت کے معاملے میں عام مسلمانوں سے نہ الگ رہے اور نہ پیچھے رہے لیکن آگے چل کر جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے، ان کا اثر روایات پر بھی پڑا اور اس کی وجہ سے ایک واقعہ کچھ تھا اور اختلاف تعبیر و ادا سے کچھ سے کچھ ہو گیا''۔ (ص ۸۳)

مولانا کے خیال کا اگر اعادہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ مسائل یا خرابیاں روایات پر انحصار کرنے کا نتیجہ ہیں اور روایات بھی کون؟ کتب حدیث ہی کی نہیں تاریخ و مغازی اور فتوح کی۔

حدیث قرطاس پر بھی مولانا کے بعض خیالات محتاج بحث و تنقیح ہیں اور مولانا شبلیؒ پر بعض جگہ جو نقد کیا ہے وہ بھی محل نظر ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے ان بحثوں کو قلم انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

کسی تحریر کی خوبی کے لیے حسن خیال و معنی ہی کی طرح حسن بیان اور جدت ادا بھی ضروری ہے، مولانا کی کتاب میں یہ دونوں خوبیاں بہ درجۂ اتم موجود ہیں، اس کتاب میں مولانا نے تاریخ و سیر ہی میں اپنی مہارت کے جوہر نہیں دکھائے ہیں بلکہ اس سے اندازا ہوتا ہے کہ تفسیر، حدیث اور فقہ و کلام میں بھی انہیں مکمل دست گاہ تھی۔

✿✿✿✿

میر عماد الدین محمود الٰہی الحسینی ہمدانی (۱)

از:- نور السعید اختر ☆

عہد مغلیہ کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اب بھی کچھ گوشوں پر دبیز پردا پڑا ہوا ہے، قدیم فارسی ادب کا بیشتر سرمایہ دنیا کے کونے کونے میں بکھرا پڑا ہے، اس لیے ان کی تلاش وجستجو اور حصول یابی آسان نہیں، علاوہ ازیں ان کے نقول کی فراہمی کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہوتا ہے، ہر کتب خانے کے الگ الگ اصول وضوابط ہوتے ہیں، کہیں پر مخطوطات کے چند اجزا کا زیراکس دست یاب ہے تو کہیں پر اس کی مائکروفلم یا مائکروچپ تک رسائی ہے، مائکروفلم یا مائکروچپ کے مقابلے زیراکس کا پڑھ لینا نہایت آسان ہے، مائکروفلم کے لیے ریڈر درکار ہوتا ہے جس کی سہولت ہر لائبریری میں نہیں ہے، اجرت کی بھگتان کا مسئلہ علاحدہ ہوتا ہے، ان تمام دشواریوں کے باوجود راقم نے دیوان الٰہی اور تذکرۂ خزینۂ گنج کی مائکروچپ حاصل کرلی اور برس ہا برس کی امیدوں کے چراغ روشن ہوگئے۔

اس سے قبل کہ میر الٰہی کے حیات اور افکار پر روشنی ڈالی جائے ہماری نظر تذکرہ الٰہی (خزینۂ گنج) کے ابتدائی صفحے پر پڑتی ہے جس کے بائیں طرف تذکرۂ شعرا اور اس کے بازو میں تذکرۂ الٰہی مرقوم ہے اور اس صفحے کے اختتام سے قبل برلن لائبریری جرمنی کی گول مہر لگی ہوئی ہے، سیدھی طرف ایک رباعی اور بقیہ اشعار ہیں جو ترچھے لکھے ہوئے ہیں اور بہ مشکل پڑھے جاسکتے ہیں، اشعار کے بعد کی عبارت ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخطوطہ معارف پرور، ادب نواز مغلیہ بادشاہ بیگم نور جہاں

(۱) مولف تذکرۂ والہ داغستانی، صاحب عرفات العاشقین اور ان کی تقلید میں مجمع النفائس کے مولف نے الٰہی کو "اسعد آبادی" لکھا ہے۔

☆ ایل، آئی، ایف ۱۰۷، اندھیری ایسٹ، ممبئی ۹۳۔

کی کنیز بی لالی اصفہانی کی نگرانی میں تھا جو دربار شاہی میں کتابت کے فرائض پر مامور تھی، چنانچہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

بی لالی صفاہانی .... نوکر نور جہاں بیگم بودہ، چو کاتب درگاہ بادشاہ بود

ظاہر ہے کہ بادشاہ بیگم کے شاہی کتب خانے کا کتاب دار کسی مرد کا ہونا خلاف قیاس ہے، ڈاکٹر اشپرنگر اور ڈاکٹر اسٹورے نے اس امر کی طرف توجہ کیوں مبذول نہیں کی ممکن ہے ان لوگوں نے اس عبارت کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یا قصداً اس کی طرف توجہ نہیں کی، بہر کیف اس حقیقت کے پیش نظر اس مخطوطے کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔

تذکرہ الٰہی (خزینۂ گنج) کے ساتھ برلن لائبریری نے دیوان الٰہی کا ناقص الطرفین دیوان بھی راقم کو بھیج دیا، ذیل میں تذکرہ الٰہی اور دیوان الٰہی کے دست یاب مخطوطات کی تفصیلات دی جارہی ہیں:

۱- تذکرۂ الٰہی (خزینۂ گنج): مملوکہ برلن لائبریری کیٹلاگ از اسٹوری ص ۶۴۶، ۱/۱-۸۱۶ص۔

۲- تذکرۂ الٰہی (خزینۂ گنج): متعارف کردہ از پروفیسر عبدالحق، معارف اعظم گڈھ، اکتوبر ۱۹۷۴ء۔

یہ نسخہ کچھ عرصے کے لیے ڈاکٹر حق کی ذاتی ملکیت میں تھا، ۲ جلدیں مکمل مقدمہ ندارد۔

۱- دیوان الٰہی: برلن لائبریری برلن، جرمنی، ش ۹۳۹، ۱۰۵۲ھ فہرست اشپرنگر (اودھ کیٹلاگ) ش ۲۷۷؟۔

۲- دیوان الٰہی: رام پور، شمارہ ۳۴۸۷، فہرست مخطوطات فارسی، صولت لائبریری ردیف، کتاب خانہ ۵۵۵۶م، میر عماد الدین محمود بن حجۃ اللہ الٰہی ہمدانی (اسد آبادی) معروف بہ "بمیر الٰہی" متوفی (درتاریخ کیثر) ۱۰۴۳ھ؟

۳- دیوان الٰہی: فہرست مخطوطات فارسی مرتبہ ریو، جلد ۲، ص ۶۹۷ ب، برٹش میوزیم، نمبر ۲۵۳۳۰، کل صفحات ۱۹۶، مرقومہ ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء۔

اب ہم ان کے دست یاب حالات پیش کرتے ہیں:

میر عمادالدین محمود الٰہی، الحسینی، ان نابغۂ روزگار برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن کی قدر ومنزلت مغل بادشاہوں، حاکموں اور صوبہ داروں نے ہاتھوں ہاتھ کی، میر الٰہی کے والد امیر حجۃ اللہ کا تعلق ہمدان اور کرمان کے درمیان واقع ایک موضع ''اسعد آباد'' کے حسینی سادات سے تھا، اسی مناسبت سے الٰہی...... اپنے نام کے ساتھ ''الحسینی'' کا اضافہ کرتے ہیں:

''ایں تذکرۂ الٰہی عمادالدین محمود الٰہی الحسینی، مطلع شیخ رافرمودہ، شنیدہ ام از تذکرۂ الٰہی''۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے الٰہی کی شہرت کو ان کے تخلص پر محمول کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، الٰہی کا دیوان اور ان کا تذکرہ ان کی شہرت کے ضامن ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

ہست نظم حسن ماروی شماد یوان ما، انتخاب جملہ دیوانہاست دیوان ما

الٰہی کے ہم عصر تذکرہ نویسوں نے انہیں ''اسعد آبادی'' قرار دیا ہے لیکن الٰہی نے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ ان کا تعلق ہمدان سے ہے، کہتے ہیں:

از دوری ہمدان می طپد دلم ہر چند کہ سینہ ام ہمدان دل چوں کوہ الونداست (۱) ''مولف ایں تذکرہ الٰہی الحسینی الہمدانی'' (تذکرہ الٰہی ص ۸۰، در ذکر سلمان ساوُجی)

تقی اوحدی نے انہیں عین جوانی میں دیکھا تھا، اوحدی، میر الٰہی کی ''دقت طبع'' اور ''ادراک عالی'' کا معترف تھا، چنانچہ بہ الفاظ اوحدی ''الحق جوانیست در غایت دقت طبع وادراک عالی''۔ (عرفات العاشقین ص)

حصول تعلیم کی خاطر الٰہی عنفوان شباب میں شیراز پہنچے اور وہاں ساڑھے تین سال تک شاہ داعی کی خانقاہ میں تحصیل ومعارف کا درس حاصل کرتے رہے، یہاں کی متبرک مزارات کے طواف سے روحانی فیض حاصل کیا، اسی خانقاہ کے حجرے میں انہوں نے ایرانی شعرا کے دواوین سے انتخاب جمع کرنا شروع کیا، غالباً الٰہی نے تذکرے کی تالیف کا ڈول یہیں سے ڈال دیا تھا، چنانچہ بہ الفاظ الٰہی:

''صاحب ایں تذکرۂ الٰہی در سال ہزار ودہ ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱ء بطلب علم و کمال، شیراز رفتہ بود سہ ونیم سال تحصیل معارف در آن خطۂ پاک نمودہ، بطوف مزارات

---

(۱) از دیوان الٰہی

متبرک آنجا خصوص طواف مزار شاہ داعی فائض الانوار ایشان رسید و دیوان وی را بہمہ بقعہ انتخاب نمودہ، لیکن منتخبات ...... دوران از دست رفت وکلیات وی را، غزلیات، قصاید، مثنویات، نزدیک چہل ہزار بیت گفتہ اند، (ص ۶۲، تذکرۂ الٰہی)

تحصیل علم کے اکتساب میں الٰہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''مولف ایں تذکرہ ہمدان زمان در شیراز تحصیل علم نمودی وکوکبہ استقبال و اجتماعی کہ در آن روز ہر گہ بود مشاہدہ کرد''۔ (ص ۹۶، تذکرہ الٰہی در ذکر شاہ عادل لاری)

تذکرۂ عرفات العاشقین کے مولف تقی اوحدی کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ الٰہی شیراز میں زیور علم سے آراستہ ہوکر مزید دانش وفراست کے حصول کے لیے پہلے عراق اور بعد ازاں شاہ عباس اول کے عہد میں اصفہان پہنچے اور وہاں دو سال تک قیام پذیر رہے، ہندوستان میں تحفظ جان اور ایرانی شعرا کی شاہانہ سرپرستی اور قدردانی دیکھ کر الٰہی کو ترک وطن پر مجبور کیا، الٰہی کہتے ہیں:

''از حرص مال مایل ہندوستان شدم، ویں مسند دل سیہ جگرم خوردہ خمرہ وار''۔

اس لیے الٰہی جان بچا کر ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء میں قندھار (افغانستان) پہنچے اور یہاں مرشد بروجردی کی وساطت سے قندھار کے صوبہ دار میرزا غازی ترخان سے عنفوان جوانی میں متعارف ہوئے، میرزا غازی نے الٰہی کو ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر کسی عہدے پر اپنی ملازمت میں داخل کرلیا، عبدالباقی نہاوندی نے اس امر کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ''در ایام سلطنت قندھار میرزا غازی...... اکثری از مستعدانِ ایران مثل میر الٰہی اسعد آبادی و دیگر مستعدانِ ایران بشرف ملازمت آن بختیار رسیدند''۔

الٰہی کی قسمت کا ستارہ بامِ عروج پر تھا، ۱۰۲۱ھ میں میرزا غازی بیگ ترخاں کا اچانک انتقال ہوگیا، الٰہی نے کابل کا رخ کیا یہاں ان کی ملاقات حکیم حاذق گیلانی سے ہوئی جو حاکم بخارا امام قلی خان کے دربار سے سفارت کی خدمات سے سبک دوش ہوکر لوٹ رہے تھے، میر الٰہی سے حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی لیکن وہ ان کی انا سے ناخوش ہوئے، الٰہی نے فوراً طنزاً ایک رباعی کہی جس میں حکیم حاذق کا خاکہ اڑایا ہے ؂

دائم ز ادب، سنگ سبو، نتواں شد   در دیدۂ اختلاط، مو نتواں شد

صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست با شکرِ ضبط روبرو نتواں شد

مولف بادشاہ نامہ محمد صالح کا بیان کسی تسامح کا شکار نظر آتا ہے، وہ رقم طراز ہے کہ ''الٰہی درسنہ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء با حکیم حاذق ملاقات کرد''۔ (جلد۱، ص ۳۱۸)

حکیم حاذق سے ملاقات کے ایک سال بعد یعنی ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں الٰہی کابل سے آگرہ پہنچے، تذکرۂ عرفات کے مولف تقی اوحدی سے میر الٰہی کی ملاقات اسی سال آگرہ میں ہوئی تھی، اوحدی نے اس ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''وقتی در آگرہ باہم بودیم، وی ہم در آن حوالی بود''۔ (۱۲۲-۱۲۳، بحوالہ آقای گلچین معانی)

الٰہی آگرہ میں بہ مشکل تین برس رہے ہوں گے کہ انہیں کابل لوٹنا پڑا، الٰہی دو سال تک (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء تا ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) صوبہ دار کابل مہابت خان سے منسلک رہے، اس امر کی طرف اوحدی کا اشارہ دیکھیے:

''والحال در ملازمت مہابت خان می باشد''۔ (۱۲۲-۱۲۳، گلچین معانی)

یہاں الٰہی کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا، الٰہی نے دوبارہ آگرہ کا رخ کیا اور اپنے شاعرانہ وقار کے پیش نظر شہنشاہ جہاں گیر کے دربار میں رسائی پیدا کرلی، غالباً اسی زمانے میں خالص سونے کا سکہ جہاں گیر کے نام کے ساتھ شاہی ٹکسال سے نکالا گیا، الٰہی نے ایک قطعہ میں اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

سکہ چوں زیبِ نام او برداشت بر زر سرخ آفتاب زدند
از ہماں خسروان گزیدندش انتخاب بر انتخاب زدند
پادشاہِ زمانہ نور الدین کو جہاں گر شد تیغ و نگیں ص ۱۴۹، دیوان الٰہی، برلن

یہ بہت ممکن ہے کہ معارف پرور، ادب نواز ملکہ نور جہاں کی سرپرستی بھی حاصل رہی ہو، زیر نظر تذکرہ الٰہی کا مخطوطہ پادشاہ بیگم نور جہاں کی کنیز اور شاہی کاتب لالی اصفہانی کی تحویل میں تھا۔ (دیکھیے تذکرہ الٰہی کے سرورق پر تحریر کردہ نوٹ)

صوبہ دار مہابت خان کے قندھار سے چلے جانے کے بعد الٰہی نے شاہی امرا سے

روابط استوار کیے اور ان کی زوردار سفارشات سے شاہی تقرب کی راہ ہموار کی، اسی دوران یعنی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء کے مابین بے تکلف ہم نشینوں کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کا ذکر الٰہی نے اپنے تذکرے میں مولانا آگہی کے بیان کے دوران صفحہ نمبر ۲۲ ب پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''چنانچہ وقتی مولف ایں تذکرۂ الٰہی در...... ہندوستان با جلیس نشستہ بود و شیشۂ صہبا بر پای ایستادہ و حجاب عقل از پیش خاستہ، گلہ از وضع بیقید سای خود نمودہ گفتم، کہ روزگاری سالہ بر من بہ گذرد، ہرگز دستم بہ پیانہ آشنا نبود، امروز بتقاضای مشرب اہل ہندوستان الاکیش افتادہ ام و عمری بیہودہ می گزارم''۔ (ماخوذ تذکرۂ الٰہی)

میر الٰہی کے مندرجہ بالا بیان اور دیگر شواہد کی روشنی میں میر الٰہی کے سال پیدائش کا تعین بڑی حد تک ممکن ہوگیا ہے۔

میرزا غازی ترخان صوبہ دار قندھار کے انتقال دو سال بعد یعنی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں مہابت خان کی کشمیر سے آگرہ کو واپسی پر الٰہی نے بھی آگرہ کا رخ کیا، الٰہی کو بہت جلد شاہی تقرب حاصل ہوگیا، ہندوستانی بلانوش دوستوں کی محفل میں الٰہی نے تیس سال کی عمر میں پہلی بار شراب کا پیالہ منہ سے لگایا، بہ قول الٰہی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں ان کی عمر تیس برس کی تھی، اگر ہم ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء سے تیس سال گھٹا دیتے ہیں تو الٰہی کا سال پیدائش نکل آئے گا، ہمارے اندازے کے بہ موجب الٰہی ۹۹۴ھ/۱۵۸۵ء کے آس پاس پیدا ہوئے اور غنی کشمیری کے تاریخی مادے کے مطابق ''بود سخن آفرین'' تک بقید حیات رہے، گویا الٰہی کی طبعی عمر ۷۰ برس کی تھی، ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء لیکن ڈاکٹر عبدالحق (۱) کے تحقیقی بیان کے مطابق الٰہی ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء تک زندہ رہے، ایسی صورت میں الٰہی کی طبعی عمر میں ایک سال کا مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

جہاں گیر کے انتقال کے بعد ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء میں شاہ جہاں نے ظفر خان احسن کو کشمیر روانہ کیا تھا، مغلیہ سلطنت کے قوانین کے مطابق کسی اہم عہدے پر تقرر کے وقت مقامی لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کی ضمانت دینی لازمی تھی، دربار میں میر الٰہی حاضر تھے، انہوں نے فی البدیہ کہا ''خدا ضامن و رسول و چار یارش''۔

---

(۱) مقالہ ''تذکرۂ الٰہی'' ''خزینہ گنج'' از ڈاکٹر عبدالحق، معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء، اعظم گڈہ۔

بادشاہ کو الٰہی کا استدلال پسند آیا، ظفر خان احسن جیسے علم پرور، معارف نواز امیر کو بھی یہ بات بھا گئی، بادشاہ سے عرض کر کے الٰہی کو اپنے ساتھ کشمیر لے گئے، جہاں پر احسن کو ان کے والد خواجہ ابوالحسن تربتی کا نایب بنایا گیا تھا، خواجہ ابوالحسن تربتی کا ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں انتقال ہوا، یہ شاہ جہاں کی حکومت کا پانچواں سال تھا۔

اپنے والد کے بعد ظفر خان احسن طویل عرصے تک کشمیر کا صوبہ دار رہا، الٰہی نے احسن کی ادب نوازی اور رعایا پروری اور دیگر فاتحانہ کارناموں کو بہ ذاتِ خود دیکھا، بالآخر احسن کو ٹھٹھہ بھیج دیا گیا جہاں ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء (۱) میں احسن کا انتقال ہوگیا، ٹھٹھہ (سندھ) نزد کراچی میں ان کا شان دار مقبرہ ہے۔

ایک مرتبہ ظفر خان احسن کو کشمیر کی صوبہ داری سے معزول کر دیا گیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد دوبارہ ان کا تقرر ہوگیا، اس کے بعد انہیں ٹھٹھہ (سندھ) کا صوبہ دار بنا دیا گیا، احسن نے آخری سانس تک اپنے فرایض بہ خوبی انجام دیے، سرکشوں کی سرکوبی کی، ہر طرح سے امن وامان برقرار رکھا، میر الٰہی نے اپنے مربی کا ہر حال میں ساتھ نہیں چھوڑا، احسن کی جنگی فتوحات اور ادبی کارگذاریوں پر پرشکوہ قصیدے کہے، احسن اور دیگر امرا کی قدردانیوں کو خوب سراہا، کشمیر کی نشاط انگیز فضاؤں، مرغزاروں اور پھولوں سے بھری وادیوں میں گنگناتے ہوئے حیات بخش چشموں کے کنارے شعر وسخن کی محفلیں آراستہ کیں، شعر وشاعری کے معیار کو بلند تر مقام بخشا اور خود بھی ان عرفانی محفلوں کی شمعِ فروزاں بنے رہے، اسی جنت نشان خطے میں دارِ فانی کو لبیک کہا اور اسی فردوس بریں کی خاک میں مدفون ہوئے۔

تاریخ اعظمی کے مولف نے اطلاع دی ہے کہ:

''میر الٰہی در احاطۂ مقبرۂ شیخ بہاء الدین جانب غرب مقبرۂ ایشان مدفن یافتہ وسنگی بربالینِ قبرش ایستادہ است، این کتبہ دارد

میر الٰہی ملک ملکِ نظم بود در اقلیم سخن بے قرین سالِ وفاتش طلبیدم ز عقل

گفت بگو'' سخن آفرین-۱۰۶۳ھ

(۱) ماثر الامرا، ص ۳۷۴، از شاہنواز خان۔

مولف ''سروآزاد'' اور بلبل کشمیر غنی کی کہی ہوئی تاریخیں زیادہ معتبر ہیں، غنی کشمیری نے الٰہی کے رحلت کی تاریخ ان الفاظ میں کہی ہے:

مادہ تاریخ:- ''بود سخن آفرین'' ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳ء)

خلاصۃ الافکار از ابوطالب کا کہا ہوا مادہ تاریخ جس سے میر الٰہی کا سالِ وفات ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء برآمد ہوتا ہے اور مرأت جہان نما میں پایا جانے والا سال وفات ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء صحیح نہیں ہیں، سراج الدین علی آرزو نے بھی الٰہی کی تاریخ وفات نظم کی ہے جس سے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء برآمد ہوتے ہیں (تذکرۂ نتایج الافکار اور شمع انجمن میں بھی یہی سال ۱۰۶۴ھ درج ہے)۔

ڈاکٹر پروفیسر عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی دہلی کو ''تذکرۂ الٰہی'' کا مکمل قلمی نسخہ کسی جون پور والے صاحب کی معرفت ملا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس نسخہ کا تعارف معارف اکتوبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں کرایا تھا، ڈاکٹر صاحب کا ادعا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے جو ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۶۵۴ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا، نسخہ کے ترقیمہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

''تمام شد ایں دفتر اول از تذکرہ الٰہی کہ در ذکر متقدمین شعرای علیین مکان را دوشنبہ ماہ شوال بتاریخ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء ہزار وشصت و پنج ومولف ایں تذکرہ الٰہی عماد الدین محمود المتخلص بہ الٰہی حسینی ابن امیر حجۃ اللہ حسینی اسعد آبادی الہمدانی است''۔

(معارف: اکتوبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۱۰)

ڈاکٹر عبدالحق سے رابطہ قایم کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک جون پوری صاحب اسے سرحد پار لے کر چلے گئے، کاش ڈاکٹر صاحب نے کم از کم اس کا زیراکس ہی محفوظ کر لیا ہوتا، ان حالات میں ان کے مقالے کے پس منظر میں کوئی مستند رائے نہیں قایم کی جاسکتی ہے۔

سید حسام الدین راشدی نے الٰہی کے مشہور باغ کی بابت یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ''الٰہی نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں کشمیر میں نوشہرے کے جنوب میں ''باغ الٰہی'' کے نام سے ایک باغ بنوایا تھا، ظفر خان احسن کے علاوہ کئی اور شعرا نے بھی اس باغ کی تعریف کی ہے، ظفر خان نے تعریف میں بہت سے شعر کہے ہیں، یہ شعر بھی لکھا ہے:

یکی از باغہا، باغِ الٰہی است کہ رضوان را ز رشکش چہرہ کاہی است

دران گلشن یکی کہنہ چنار است   ز نخلِ طور ، گوئی یادگار است[1]

یہ باغ اس کہنہ چنار کی وجہ سے "باغ چنار" کے نام سے بھی مشہور ہے، کسی شاعر نے یوں تاریخ نکالی ہے:

گریبان میکشد ، خواہی نخواہی   بسوی خود ، مرا ، باغ الٰہی

فلک آشفتہ بود از بہر سالش   ملک گفتا ، بگو ، باغ الالٰہی۔ ۱۰۵۰ھ

میر الٰہی اشعار کے پس منظر میں میر الٰہی نے ایک قصیدے میں اپنے ذاتی حالات کی ترجمانی کی ہے، ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی نے زمانے کے سرد وگرم سے کس طرح نبرد آزمائی کی تھی، وہ خود کو مارِ گنج سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حالاں کہ مارِ گنج گوشہ نشین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس دھن دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت کی ساخت وپرداخت بالکل علاحدہ طریقہ سے ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور مزاج میں سات دنیاؤں اور ہفت آسمانوں کا تجربہ موجود ہے، لہٰذا ان کی ذات کا ہر ایک حصہ ہفت پہلوی اوصاف کا حامل ہے، الٰہی کبھی تنگیِ روزگار کا گلہ کرتے ہیں تو کبھی تلاشِ معاش کا دکھڑا بیان کرتے ہیں، آئے دن کی تلخیوں کو سہتے سہتے وہ مزاجاً سنگین ہوجاتے ہیں اور تڑپ کر کہتے ہیں کہ ان کے پاس ستم ہائے روزگار کا علاج، خونِ دل پینے کے سوا کوئی اور نہیں ہے، حالات نے انہیں سنگ دل ضرور بنادیا ہے مگر اصل میں وہ گوہر سے بھی زیادہ نرم ونازک ہیں، آخر میں اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ عشق نے ان کو نہایت لاغر وکم زور بنادیا ہے، وہ مبالغہ کی حد تک بے وزن ہوگئے ہیں، نقاہت کے باعث ان کا بدن کپڑوں سے باہر آگیا ہے، نقاش کے لیے ان کے لاغر بدن کی تصویر بنانا بہت آسان ہوگیا ہے، اس کے باوجود بھی وہ باہمت رہے اور فلک کج رفتار کا مقابلہ کرتے رہے، یہ صرف اس لیے کہ الٰہی خود کو ظالم آسمان سے بدرجہا قوی تر سمجھتے ہیں، مندرجہ بالا خیالات، جذبات اور احساسات کی نمایندگی کرنے والے اشعار ملاحظہ کیجیے:

چوں مارِ گنج گوشہ نشیں توانگرم   اندیشہ مہرۂ مار است درسرم

دنیائے دیگرم بتحقیق کہ دادہ اند   تربیت ہفت کشورم ہفت پیکرم

بر سینہ و کنارِ من ایں قلبہای داغ   دینا زر شد از نفس کیمیا گرم

(۱) ترخان، راشدی، ص ۱۹۹

چوں تاج در سرشت بود قدیم ولے   چوں تیغ زاج نازدہ مقصت جوہرم

گرداب آبشست مرا کشتی مراد   بال سمندرست دریں ورطہ لنگرم

چوں گور کافرست بمن غبارِ دہر   روز و شب زمانہ بکثرست منکرم

چرخِ سیہ کاسئہ دون کے دہد خورش   جز شیر مرغ و بیضہ سنگین کبوترم

کردم بسی شکایتی از تنگیِ معاش   شد خونِ دلِ اضافۂ رزقِ مقدرم

آخر شدم ز سنگ دلی رفتہ رفتہ سنگ   از جنس مرمرست مگر است گوہرم

بخت سیاہ برسر بستاں خویش داشت   از شہر می برید بطفلی چو مادرم

من از گرسنہ چشمے طفلانہ کہ بود   آن شیر برمکیدم و شد روح پرورم

آمیختہ بہ بختِ سیاہست ایں زماں   شیر سفید گر رہے از حوض کوثرم

بمیانہ بر نشستہ بشاخِ درختِ عمر   ...... بمغیِ از رہِ عصیان ہمی برم

زنگم مشکست و عشق چناں ساخت لاغرم   کز رنگ خویش ہم بکہ وزن کمترم

تشریح تن کند ز برون سوی پیرہن   نقاش در نگارش تصویر لاغرم

ارباب ہمتم نگبد آسمان خیال   کز آسمان ہزار فلک وار برترم

میر الٰہی ایک جگہ کہتے ہیں کہ ان کے حالات ناسازگار اور ناگفتہ بہ ہیں، بہتر ہے یہ در پردہ رہیں تاکہ انہیں اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے، دراصل الٰہی کو اپنی بدقسمتی سے شکایت ہے، چنانچہ اس کے اعتراف میں کہتے ہیں ؎

حدیث من بجگر خواری آسا است مپرس   ہماں بہ است کہ در پردہ ماند ایں احوال

کدام قصۂ من زو در سراچۂ گوش   کہ گریہ از تہِ دل نایدش باستقبال

مرا شکایتے از طالع است خواہم گفت   پس از بدیحِ بحجابِ بارگاہِ جلال

الٰہی کے تعلّی آمیز اشعار میر الٰہی کے تعلّی آمیز اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہیں اپنے اشعار کلام بلاغت نظام پر فخر تھا، وہ اپنے کلام کو خلاق معانی کی شان تصور کرتے اور دیوان کو اساتذہ کے جملہ دواوین پر ترجیح دیتے، نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے بیش بہا ہونے کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ما از ہمہ کس بیش بہایم الہٰی   در شہر اگر مردم بیکار فرو شند

الہٰی خود کو طبعاً دریا ضمیر تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

منم آن الہٰی دریا ضمیر کز طبعم   گہر لبالب دریا سحاب کرد دام

اپنے لقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جمال الدین جہان لقب الہٰی را   چو بہر خلقِ معانی کمالِ شان آید

اپنے کلام بلاغت نظام کی توصیف میں کہتے ہیں:

ہست نظم حسن ماروی شما دیوانِ ما   انتخاب جملہ دیوانہاست دیوانِ ما

لحن بلبل کی طرح چہکنے والا الہٰی کہتا ہے:

ایں منم چوں لحنِ بلبل دست بر دستِ بساط   واں توئی چوں جلوہ گل دوش بر دوشِ کمال

کشمیر، میر الہٰی کی نظر میں میر الہٰی نے ایک قصیدہ ظفر خان احسن کی معرکہ آرائیوں اور جنگی فتوحات کی توصیف میں کہا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ کشمیر میں ساری رعنائیاں، بہاریں ظفر خان احسن کی مرہون منت ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

افراخت علم نورِ مہ بخت بر تقدیر   گل کرد زمینان ظفر طالعِ کشمیر

فردوس چوں پرداختہ از کفِ تقدیر   گردید جگر گوشہ ہا او گوشۂ کشمیر

خار از رطوبت شدہ چنداں بنزاکت   کور اشکند کوہکن از تیشۂ تصویر

فردوس بمدح گر کشمیر حلال است   گر خس پنہانش نمک دادۂ تقریر

یعنی کہ دریں بوم چو گل کرد بہاری   اسبپ خزانش نرسد چو گل تصویر

از فیضِ دما دم کہ بکشمیر مہیا است   ہست از قدم خان ظفر یاب عدو گیر

لشکر شکن معرکہ آرای ظفر خان   کز تیرہ دل خارہ کند چوں رخِ کفگیر

الہٰی بہ حیثیت شاعر شہنشاہ جہاں گیر اور شاہ جہاں کے سر برآوردہ شعرا میں میر الہٰی کا شمار ہوتا ہے، تذکرہ نگاروں نے الہٰی کو ایک معتبر شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، حالاں کہ الہٰی کے تذکرے کے سلسلے میں خاموش رہے، الہٰی نے بھی تذکرے میں ذاتی حالات نہیں لکھے، تین سو پچاس صفحات پر منحصر تذکرے میں صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں الہٰی نے اپنی ذات سے متعلق ہلکے اشارے

کیے ہیں، ممکن ہے تذکرے کی دوسری جلد میں الہٰی نے اس کی کوشش کی ہو، افسوس ہے کہ تذکرے کی دوسری جلد ہماری دست رس سے باہر ہے:

"تمام شد ایں دفتر اول از تذکرہ الہٰی کہ در ذکر متقدمین شعرا علیین مکان را"۔

ترقیمہ نسخہ تذکرۂ الہٰی بحوالہ معارف، اکتوبر ۱۹۷۴ء، مقالہ ڈاکٹر عبدالحق

الہٰی کو چند سال سے زیادہ شاہی ہمنشینی میسر نہیں آئی، مہابت خاں صوبہ دار کابل اور ظفر خان احسن صوبہ دار کشمیر اور میرزا غازی بیگ ترخان اور دیگر امرائے قندھار و کشمیر کے پاس ان کا بیشتر وقت گزرا، الہٰی کی شاعری کا اثاثہ پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کی تعریف میں الہٰی کے رقیب اور ہم عصر یکساں رطب اللسان ہیں، مولف سخن سرایان ایران کا بیان ہے کہ:

"دیوان (الہٰی) ہندوستان میں خاص طور پر مشہور رہا"۔ بحوالہ ترخان، ص ۱۹۹، از راشدی

سید حسام الدین راشدی تذکرۂ مجمع النفائس کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ "طغرای مشہدی نے کسی معاصر شاعر کو ہجو کہے بغیر نہیں چھوڑا مگر میر الہٰی کا اپنے رسالے میں جب حال لکھا تو بڑے ادب واحترام سے"۔ (بحوالہ تذکرۂ شعرائے کشمیر، از راشدی، ص ۱۲۰۰)

سید حسام الدین راشدی میر الہٰی کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"ان کی شاعری اور اشعار کی تمام تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شاعر نازک مزاج اور خوش خیال تھے، درستیِ مضمون، زبردستی زبان اور تازگیِ خیال حاصل تھی، نزاکت، استعارہ اور تازہ گوئی میں کامل تھے اور ساتھ ہی خوش خلق اور درویش مزاج بھی تھے"۔ (تذکرہ شعرائے کشمیر، از راشدی، ص ۱۲۰۰)

کشمیر کی فرحت بخش فضا اور حاکموں کا مسلک کسی حد تک ایرانی ماحول کے متبادل تھا، شاید اسی لیے الہٰی نے پایہ تخت آگرہ سے کنارہ کشی کو فوقیت دی، ممکن ہے شاہی دربار کے نامی گرامی شعرا صائب، عرفی، نظیری اور کلیم کے سامنے الہٰی کی شمع سخن ماند پڑتی ہو، ورنہ دربار شاہی میں داد و دہش کی کوئی کمی نہیں تھی، کشمیر میں الہٰی کے ہم عصر شعرا کی فہرست میں مولف تذکرۂ مآثر رحیمی نے، ملا شکوہی ہمدانی، آقای رضی، طالب آملی، محوی اردبیلی، حکیم شفائی، سروری یزدی،

ظفر خان احسن کے اسمائے گرامی دیے ہیں۔

الٰہی ہمدانی صوبہ دار کشمیر ظفر خان احسن کے نام ور شعرا کی کہکشاں میں روشن ستارہ کی مانند تھے، احسن کی محفل شعر و ادب میں کلام الٰہی کی آب و تاب سب سے جداگانہ تھی، یہ بات اور ہے کہ طالب آملی کو ۱۰۲۸ھ میں جہاں گیر نے ملک الشعرا کے خطاب سے نواز دیا تھا۔

میر الٰہی کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے ان کے شاعرانہ محاسن کو سراہا ہے، بالخصوص تقی اوحدی اور محمد صالح کنبوہی (لاہوری) نے الٰہی کے کلام کی شاعرانہ خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی فصاحت و بلاغت اور تفکر شعر کا ذمہ دار ذیل کے نکات کو قرار دیا ہے، جن سے الٰہی کا کلام آراستہ و پیراستہ ہے، تقی اوحدی نے مندرجہ نکات کی نشان دہی کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

۱- دقتِ طبع ۲- ادراکِ عالی ۳- کمالِ شوخیِ فطرت ۴- صفائی خاطر (دارد)
۵- آبِ نظم پر از عذوبت (آبِ نظمش در نہایت عذوبت) (ترخان، راشدی، ص ۲۰۲) ۶- ابرِ فکر پر از رطوبت ۷- ہر ہر گونہ سخن قدرتی تمامش (از عرفات العاشقین)

محمد صالح کنبوہی نے الٰہی کے شعر گوئی کے وصف میں مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیے ہیں، انہیں ''مظہرِ فیضِ نامتناہی'' جیسی عقیدت مندانہ تراکیب سے تخاطب کیا ہے، ایک شاعر کے لیے اس سے زیادہ خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے، محمد صالح نے الٰہی کے کلام کی جملہ خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے:

۱- استیناس طبیع ۷- معنی برجستہ
۲- بسیار تازہ ۸- تازہ گوئی
۳- اشعار بلند آوازہ ۹- استعارہ بمرتبۂ کمال
۴- لطف کلام (بی قیاس) ۱۰- بیشتر تازگی ادا
۵- شکوہ الفاظ ۱۱- نزاکت و-
۶- بلند پروازی خیال ۱۲- ندرت استعارہ (از عمل صالح از محمد صالح کنبوہ)

تقی اوحدی اور محمد صالح کنبوہ نے الٰہی کی شاعرانہ خصوصیات کو مجموعی طور پر یکے بعد دیگرے احاطہ کر لیا ہے جو ایک معیاری شاعر کا خاصہ قرار دی جا سکتی ہیں، اوحدی سے ملاقات کے وقت

میر الٰہی نوجوانی کی دہلیز کو پار کر رہا تھا، اوحدی نے الٰہی کی شعری اُپج کو دیکھ کر یہ کہنے میں دریغ نہیں کیا تھا کہ ''اگر الٰہی اسی انہماک سے شعری وجدان کی مشق کرتا رہے تو یقیناً ایک اونچے درجے کا کامیاب شاعر ثابت ہوگا، اوحدی کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''اگر توفیق مشق یابد، شاعری بغایت خوب خواہد شد، تا غایت دو ہزار بیت گفتہ، ادراک درست رسائی دارد، سخن نیز خوب می رسد''۔ (عرفات، ص ۲۳-۱۲۲)

میر الٰہی تقی اوحدی کی لیاقت و فراست سے مرعوب تھے، جس وقت آگرہ میں دونوں بہت قریب تھے، الٰہی نے چند تازہ اشعار اوحدی کے ملاحظہ کے لیے ارسال کیے تھے اور اوحدی کی شان میں ایک رباعی بھی نذر کی تھی جس کے جواب میں اوحدی نے بھی ایک رباعی الٰہی کے لیے کہی تھی ؂

الٰہی کی رباعی:

بر دوشِ سخن گر ز غلط باری ہست
سہلست اگر مدد ز غم خواری ہست
از داوری اصلاح شفا خواہد یافت
در بیتی اگر مصرع بیماری ہست

جوابِ اوحدی (۱):

جز فیضِ الٰہی از کست یاری نیست
ادراک تو محتاج مددگاری نیست
نظم تو ز صحت ست چون چشمِ بتان
در چشم بتان عیب ز بیماری نیست

میر الٰہی نہایت نازک طبع تھے، اسی نازک مزاجی نے انہیں ہجوگوئی کی طرف مائل کر دیا تھا، الٰہی نے اپنے ہم عصروں کو تنگ مزاجی کا شکار بنایا، مولف عرفات نے اس بابت ایک جملہ لکھا:

(۱) ''تقی در آگرہ بودیم دی ہم در آن حوالی بود، شعری چند تازہ گفتہ نزد مخلص فرستاد و بجہتِ مخلص خود ایں رباعی ہم گفتہ داخل آنہا فرستاد، بندہ ہم جواب کردہ فرستادم''۔ ماخوذ از ترخان از راشدی، ص ۳۰۷۔

''در صفاہان ذوقی اردستانی را اباجی، بسیار، برنحوی کہ سنت شعرای عصریست

گفتہ است''۔ (ماخوذ از گلچین معانی، ص ۵۱۹)

میر الٰہی کی بابت کہی ہوئی تقی اوحدی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، الٰہی کے بہت جلد مشق بہم پہنچائی اور اپنی شاعری کو فن شعر کی تمام نزاکتوں سے ہم کنار کر دیا۔

تذکرۂ الٰہی (خزینہ گنج) کے مطالعہ کے بعد ایسے حوالے دست یاب ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ میر الٰہی چند متقدمین شعرا سے کس حد تک متاثر تھے۔

الٰہی خواجہ سلمان ساوجی کی شاعری اور خصوصاً رباعی گوئی کے ازحد معترف تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

''مولف این تذکرہ الٰہی، الٰہی الحسینی الہمدانی این رباعی خواجہ سلمان ساوجی

را متراوی ساختہ وحسن ادای اور امیکوتر از اول پرداختہ ...... کہ بر عارفان روا است''

رباعی	رباعی
خوابم شبکی چنانکہ تو دانی و من	خوابم شبکی چنانکہ تو دانی و من
بزمی کہ درآن بزم تو دانی و من	دور از کہہ و مہ تو دانی و من
من زیر بسترت خوابانم و تو	من بزیر بسترت بخوانم و تو
آن کس کہ مست را بخوابانی و من	آن کہ .... را بخوبانی و من
خواجہ سلمان ساوجی	میر الٰہی تذکرہ الٰہی، الف ص ۸۰ (درحاشیہ)

میر الٰہی نے مولانا آہی کے لیے ''شائستۂ رحمت الٰہی'' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں، ایسا لگتا ہے الٰہی کو مولانا آہی سے عقیدت تھی، الٰہی کو مولانا آہی کی ایک غزل بہت پسند آئی لہذا انہوں نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی، چنانچہ رقم طراز ہیں:

''مولف کتاب الٰہی الحسینی جواب این غزل پرداختہ ودر پہلوی ہم مرقوم است

غزل الٰہی

(کذا) ...... آب زدہ ... بگر سیر نالہ را	بر دوشِ سبزۂ مژہ بین رقص ژالہ را
بیداری کرشمہ ... از چشم مخواب	شب زندہ دار سینۂ من کرد نالہ را

بے سوز عشق فایدہ با داغ سینہ نیست	ورنہ از این متاع بسی ہست لالہ را
طومار دل رسانیدہ ام الٰہی بہر عشق	کردم بجل بخط بتان این قبالہ را

(تذکرہ الٰہی، ب ۳۶)

جمالی اردستانی کے تذکرے میں، پر جمالی طایفہ سے متعلق ایک شعر کہا، چنانچہ لکھتے ہیں:

''محرر این تذکرہ الٰہی بیتی مشتمل بر ذوق این طایفہ (بنام پر جمالی) گفتہ تحریر نمود۔

تا ہست جان در آستین آہنگ رقص می کنم

کذا؟ گزینم دست، دست افشاندم صد سالہ رفتار ما بود''۔

مولانا یسمی کو بے مثال معما گو تصور کرتے ہوئے الٰہی ان کی طرز میں ایک رباعی کہتے ہیں:

''مولف این تذکرہ الٰہی، الٰہی الحسینی رباعی..

صفتِ اشتہا، گفتہ بود، بجہتِ مناسبت مقام در رقم آورد''۔

رباعی:

ہر گوشہ کہ اشتہای سوہان زدہ است

در کشور معدۂ تو جمع آمدہ است

از بس کہ نخاییدہ و بری تیکر فرو

ہر لقمہ ز دست تو دل خون شدہ است

(تذکرہ الٰہی، ص ۸۲)

فارسی ادب میں جلال الدین آذری کا تذکرہ ''آتش کدہ'' بڑی شہرت کا حامل ہے، وہ ایک مستند شاعر بھی ہے، الٰہی ان کی شاعرانہ برتری کے معترف ہیں، یہی وجہ ہے کہ الٰہی ان کے دیوان کو ''گنج سراسرِ جواہرات'' کے نام سے اپنے تذکرے میں یاد کرتے ہیں، الٰہی کو اس بات کا افسوس ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں آذری کی شاعرانہ موشگافیوں کا پوری طرح سے احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، البتہ انہیں آذری کا ایک مطلع پسند آیا جس پر الٰہی نے تضمین کی ہے اور اس طرح آذری کو خراج تحسین عطا کیا ہے، الٰہی لکھتے ہیں:

"دیوان، او گنج سراسر جواہرات وایں تذکرہ کہ خزینۂ گنج الٰہی است گنجایش

تمام آن ندارد، خلاصہ از غزلیات ایشاں کہ بخوبی تمام دیوان درست مرقوم می شود......

مطلع شیخ را کہ فرمودہ ام

کہ بریں طارم زر اندود است   خطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است   (آذری)

تضمین الٰہی: نوشتہ اند الٰہی بگر باد فریاد   خطر کہ عاقبت کار جملہ محمود است   (الٰہی)

اس میں شک نہیں کہ شعر و شاعری کے میدان میں میر الٰہی اپنے معاصرین میں سر برآوردہ تھے، الٰہی نے اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر شاہ جہاں مہابت خان اور ظفر خان احسن کے قصیدوں میں دکھائے ہیں، دیگر صوبہ داروں اور امیروں کی مدح سرائی سے مزید قدردانی کے مستحق ہوئے اور اپنا ایک اہم مقام پیدا کیا، مولف عرفات نے ان کے دو سو کے قریب اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے، راقم کے پاس الٰہی کے دیوان کا زیراکس ہے جو برلن لائبریری جرمنی کا مخزونہ ہے، اس دیوان میں الٰہی کے چار ہزار سے زیادہ اشعار ہیں، دوسرا دیوان برٹش میوزیم لندن اور تیسرا صولت حسین لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، راقم ان دواوین کے تقابلی متن کے بعد الٰہی کے دیوان کا مصحح نسخہ تیار کرنے میں کوشاں ہے، فی الوقت راقم کی پوری توجہ الٰہی کے تذکرے کی چھان بین پر مرکوز ہے، ذیل میں الٰہی کا چیدہ چیدہ منتخب کلام پیش کیا جارہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم الٰہی کے اشعار کا علمی تجزیہ کریں، ان کے دیوان کے مشمولات پر نظر ڈال لینی ضروری ہے:

۱-دیوان الٰہی: سنہ کتابت ۱۰۴۲ھ، مخزونہ برٹش میوزیم کے مشمولات

۱- قصیدہ در مدح ایتماء
۲- شاہ جہاں (قصیدہ)
۳- مہابت خان (قصیدہ)
۴- دیگر امرا (قصیدہ)
۵- تاریخی مادے
۶- ترجیع بند
۷- قطعات
۸- مرثیہ در بارہ حضرت حسین
۹- مثنویاں بوزن مخزن (نظامی گنجوی)
۱۰- غزلیات
۱۱- رباعیات
۱۲- ترقیمہ ندارد

منتخبہ اشعار کے پس منظر میں میر الٰہی کا محاکمہ یہ بات بڑے رسوخ کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ الٰہی کے اشعار میں زبان کی پختگی اور شاعرانہ تدبر کی جھلکیاں بہ درجۂ اتم نمایاں ہیں، ان کے یہاں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ وسعت نظری اور صنائع و بدائع کا برجستہ استعمال موجود ہے، الٰہی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کے اشعار معاملہ بندی اور عشق و عاشقی کے غوامض کی مکمل نمایندگی کرتے ہیں، الٰہی نے قصیدہ نگاری کے میدان میں اشہب قلم کی جولانی دکھائی ہے، انہوں نے شاہ جہاں کے علاوہ، مہابت خان، ظفر خان احسن، میرزا غازی بیگ ترخان کے علاوہ دیگر امرا کے قصیدے بھی کہے ہیں، ظاہر ہے ان قصیدوں کے پس پردہ ان کے نان و نون کا مسئلہ جڑا ہوا تھا۔

جناب توحید عالم نے الٰہی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"الٰہی ایرانی مذاق سخن رکھتا تھا اور شاعری میں اس کا رتبہ بلند تھا"۔

تقی اوحدی نے الٰہی کو "مجموعۂ کمال ہمہ دانی" اور محمد صالح کنبوہ لاہوری نے "مظہر فیض ناتناہی" کے القاب سے الٰہی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے، الٰہی کے اشعار ان کی شوخ طبعی اور لطیف احساسات کی نمایندگی کرتے ہیں۔

الٰہی نے فرسودہ راستے سے ہٹ کر غزل کہنے کی جرأت کی ہے، اسی لیے "آب رُو" سے نظارہ آب ہوجاتا ہے اور شرارہ حسن کی تاب نہ لاکر آفتاب محبوب کے حسن و جمال کی نقاب بن جاتا ہے:

ز آب روی تو نظارہ آب می گردد   ز طلعت تو نقاب آفتاب می گردد

الٰہی صحرائے عشق میں چوکنا رہنے کی ترغیب دیتے ہیں، الٰہی کی اس تنبیہ کا اطلاق ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ "صیاد" کی طرف سے بے خبری خطرناک ہے۔

خواہ آہو باش خواہی شیر در صحرای عشق   بے خبر منشین کہ آن صیاد غافل می رسد

الٰہی نے اس حقیقت کی طرف پہلی مرتبہ نشان دہی کی ہے کہ اگر مجاز و حقیقت یکجا آجائیں تو عشق کی آگ دو آتشہ ثابت ہوسکتی ہے:

تا نشاۂ مجاز و حقیقت یکی شود   کاش ایں دو بادہ راہمہ در یک سبو کنند

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

آراست دکان دار چمن باز دکان را　　گل بست جنا بست زمین و زمان را

(ابتدا، دیوان الٰہی، برٹش میوزیم، ریو، فہرست، ص ۶۸۷)

ای رحمت تو سر خط لوح نجات ما　　دیباچہ از وضع تو دیوان ذات ما

(ابتدا، غزلیات، ریو، ص ۶۸۸)

شب آئینۂ رخ سحر گاہ من است　　ہر جا کہ غمی است چشم بر راہ من است

تاری کہ بہ او لباس حسرت دو زند　　ابریشم تاب دادۂ آہ من است

چو آسایش ببرمت کاش ہرگز جائی کردم　　کہ خود را چوں نگاہ بلہوس رسوائی کردم

ستم رسیدہ تر از من کسی زمانہ نیافت　　کہ دور من ہمہ ایام بی نوائی بود

چو بر فروختہ می بینمت ز آتش مے　　نگاہ بر سر مژگان کباب می گردد

چشمی بدور چشم تو بدنام خواب نیست　　وز حیرت رخت حرکت در نقاب نیست

نیلو فرم بچشمۂ مہر و وفا ولی　　در روزگار تربیتم آفتاب نیست

تا ہمچو بہار از گلستاں رفتی　　گل نوبت فریاد بہ بلبل نگذاشت

تا نسوزد ہمہ را دلبر ما ننشیند　　شعلہ چوں تند شود زود ز پا ننشیند

باشد شرارہ شبنم روی گیاہ ما　　خاکستریست شعلۂ دوزخ ز آہ ما

از آہ حسرتم جگر شعلہ آب شد　　و ز آتش دلم دل آتش کباب شد

شکست کشتی دل نامزد کردم بہر موجی　　وگرنہ خواب خوش در بستر دریا نمی کردم

بشمع طور مبر التجا کہ در رہ عشق　　چراغ وادی ایمن بدست خاشاک است

بس کہ ذکر تو باواز بلند　　ہمہ دم ورد زبان قلم است

ازاں تہ جرعہ کز لعلت نصیب خاک بستان شد　　لب ہر گل کہ بوسیدم از و بوی شراب آمد

میر الٰہی نے اپنے گھر کے حال زار کا نقشہ ایک قطعہ میں کھینچا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اے کہ ابر صدق رای روشن تو　　ماہ و خورشید اعتراف کنند

کہنہ ویرانہ لیست مسکن من　　کہ در و جوگیان طواف کنند

خفتہ بی گرد رو کشاید چشم　　مژہ ہا سقف را شگاف کنند

انتخاب از غزلیات الٰہی: (مخطوطہ برلن لائبریری، برلن)

ہر صید را داد رہائی ز دام زلف　　بر خاک می تپد و نظر سوی دام داشت

دل از نسیم سوخت الٰہی کز اں جمال　　بوئے بہار و برگ گلے ہم سفر نداشت

دستے کہ می نشانی در حالت سماع　　با جنبش نسیم گلستاں مصاحبت

الٰہی نخواندی درد من در بوستاں بنگر　　کہ بہ طومار بزرگی نوشتم داستان را

اگر در کعبہ گل سازی الٰہی مشت خاکم را　　ز فیض بت پرستی خود بخود شکل صنم گیرد

نماز و روزہ ہرگز نخوری قسم الٰہی　　قسم پیالہ نوشان بسر شراب باشد

الٰہی صید ما آہوی معنی است　　غزال ما غزالہا پے تو باشد

ز سرتاپا تمنائے تو لبستم　　دگر ما را چہ پروائے تو باشد

از الٰہی گلشن و گلخن بفریاد آمدست　　یارب ایں مست جنون را از کجا آوردہ اند

رفتم بسوے کعبہ الٰہی ز کوئے دیر　　رحمت در انتظار گناہم نشستہ بود

فسردہ ایم الٰہی چنانکہ با ہمہ سوز　　مزاج شعلہ ہمچو مغز مخمور است

فراق دوست کہ بدنام کفر و اسلامست　　ز تیرہ بختی ما نیک نام مجلس ماست

وز دیدہ برد نکہت زلف تو بہر سوئے　　تا دست الٰہی ز گریبان صبا است

ز بخت تیرۂ الٰہی مراد خوش مخواہ　　کہ رخت ہستی پروانہ، روشنائی سوخت

غزل سرا(۱) شدہ من در ہوائے شاہد بزم　　چو بلبلے کہ شود بہر گل بدیہہ دیوان

الٰہی خلوت نشین شد لیک چوں ساغر　　دلے با شیشہ و چشمے با انجمن دارد

ذوقی اردستانی کی طویل ہجو کے چند اشعار پیش ہیں:

چہ بنی است کہ در زیر گاو و ماہی اگر　　دہند گور ترا بعد مردن تو قرار

تو فیل مست و مرا خامہ (چوں) ابابیل ست　　پے ہلاک تو اش سنگ ہجو در منقار

(۱) قصیدے کا شعر

تو نیستی بمیان ہر چہ ہست بنی تست   کہ از بنائے رخت کندہ باد ایں دیوار

الٰہی اپنے کمزور و مریل گھوڑے کے بارے میں لکھتا ہے ؎

در آب اگر رود ز ہم باشد   خاصیت اسپ کاغذیں دارد

گفتم وا نمی کنم ترا 'گفتا'   مہر تو بمن نتیجۂ کیں دارد

اپسی کہ باسپ کاغذیں ماند   کی طاقت داغ آتشیں دارد

قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، صوبہ دار کشمیر ظفر خان احسن کی مدح میں رقم طراز ہیں ؎

ہر جا کہ فضل مخزن جود تو شود   دریا اگر بدست تو افتد گدا شود

مدح تو از زبان نرود زانکہ تیغ تو   تا حشر اگر نشوی جوہر نمی رود

از ہر درے کہ ہست مرادت بکام باد   کز ہیچ گونہ دولت ازیں در نمی رود

ہر جا فتادہ عکس گل آتشیں در آب   گویا بدام موج سمندر گرفتہ است

ای گل بیا کہ ہر دست از ابر چشم من   لب غنچہ بشگفد و رخ چمن چمن

گلدستہ زر از سر ہر خار بشگفد   روز یکہ جشن شاہ جہاں بوالمظفر است

صاحب قران کہ گوہر شاداب اختران   بہر نثار محفل عیشش مقرر است

مثنوی الٰہی کے منتخبہ اشعار جہاں گیر کی مدح میں ایک مثنوی کے چند اشعار:

در عہد شہنشۂ مکرم   یعنی کہ جہاں پناہ اعظم

دیباچہ عقل و نور و بینش   سر لوح کتاب آفرینش

دارا منش ، سکندر اقبال   آرایش ہر چوں سپر سال

خورشید سپر بر ماہ مسند   شاہنشۂ نور دین محمد

چوں گوہر نام بود جہاں گیر   ....

خاصیت مہر شان شہنشہ   آوردہ شکست در رخ ماہ

الٰہی کے دیوان میں ایک ساقی نامہ اور ایک نہایت دل کش بہاریہ قصیدہ بھی شامل ہے جس پر آیندہ بحث کی جائے گی۔

الٰہی کے مذہبی عقاید میر الٰہی کے مذہبی عقاید بڑی الجھن میں ڈال دیتے ہیں، ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجیے اور اندازا لگایئے کہ الٰہی کس عقیدہ اور مسلک کے پابند تھے ؎

(الف)

نہ رافضی نہ منافق نہ خارجی ہستم   کہ ہر سہ ہیزم دوزخ بروز غفراند

بہ آل عبا چار کردہ چشم امید   نشستہ ایم کہ ما را بحشر برانند

ہمہ ستائش یاران مصطفٰے شدہ ایم   دگر چہ گویم الٰہی کہ مومنم خوانند

(ب) دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

نو مسلمانم ہمی ایمان از جان آوردہ ام   وصف مئے راچوں شہادت بر زبان آوردہ ام

(ج) نقطوی تحریک سے متعلق الٰہی کا عقیدہ دیکھیے:

یک نقطہ از خط مکتوب مظہرم   لیکن بنقطۂ عالم مغیست مظہرم

(د) الٰہی کے دو ملتی ہونے کی توجیہ ملاحظہ کیجیے:

از نور لم یزل قلم صنع در ازل   بر لوح دل نگاشتہ اللہ اکبرم

محمودم از سعادت نور محمدی   در ملت صحابہ و آل پیمبرم

بر چہرہ دارم از رہ شان دو ملتی   کز بہترین حصار بود روز محشرم

تا بر سرم سایہ سادات افراست   بر تارک علاقہ کیوان رسد سرم

دین حنیف را حنفی و از بانعم   درخت چار یار چو سد سکندرم

اول تصور یست کز ادراک عقل زاد   تصدیق بر خلافت صدیق اکبرم

تریاق من محبت فاروق اعظم است   از ہر عدو کہ زہر شا ......

آخری شعر بڑا چونکا دینے والا ہے۔

سنی دلم و زبانم شیعی با علی   خلق گوید کہ من بعالم معنی دو پیکرم

الٰہی نقطوی (۱) تحریک کے مبلغ تھے، اس تحریک سے وابستہ افراد پسی خانی بھی کہلاتے تھے، شاہ عباس اول کے دور میں نقطویوں کو ایران میں سزائے موت دی جا رہی تھی لہٰذا ہندوستان

(۱) دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

عہد اکبری میں وسیع القلبی کے باعث ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا، نقطوی اہل ہنود کے مذہبی عقاید سے قریب تھے، ہندوی فلسفہ میں ایک گول انڈے کو وجود کاینات کا محرک قرار دیا گیا ہے، نقطوی فلسفہ انڈ، پنڈ، برہمانڈ کے علاوہ آواگون یعنی زندگی بعد از موت کے بھی کسی حد تک قایل تھے، الٰہی سے قبل مُلا صوفی مازندرانی بھی جان بچا کر ہندوستان چلے آئے تھے (۱)۔

نقطوی خیالات کی ترجمانی کے لیے الٰہی نے ایک مختصر مثنوی (۱۳۹ اشعار پر مبنی) خدائے سخن نظامی گنجوی کی بحر میں کہی ہے، اس مثنوی کے نصف اشعار آب زدہ ہوگئے ہیں بقیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں

الٰہی نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے حروف تہجی کی وضاحت ذیل کی مثنوی میں کی ہے، ملاحظہ کیجیے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — قافلہ سالارِ قرآن حکیم
سرو سرافراز ریاض ابد — وحی ازل از گل روی سبد
فاتحہ گوئی ز شرف کربلا است — بسملہ بحر فراتش گوا است
لوح مبین معنی بسم اللہ است — معنی قرآن بسم اللہ است
ہست چو در نقطہ اشارات ذات — چوں نبود مظہر آیات ذات
با کہ بود بر ہمہ بالا نشیں — تاج کرامت شدہ فرق مبین
بسم اللہ در فاتحۂ ہر کلام — شبیہ رسول است علیہ السلام
مہر نبوت نقطہ پای او — جوہر خط مسجد اقصای او
آمدہ دندانہ سین در حساب — شانہ کش طرۂ ام الکتاب
ہست معنی کشش مدمین — تاب دہ رشتۂ حبل المتین
حلقۂ میمش کہ بود دل کشا — شاہد شب را بود خلخالِ پا

(۱) ایران میں جب بسیخانیوں اور نقطویوں کو قتل کیا جا رہا تھا تو بہت سے شعرا اور علما وہاں سے بھاگ کر ہندوستان آئے جہاں اکبر جیسا وسیع القلب بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔ مقالہ احمد آباد میں ایرانی شعرا کی آمد، از سید امیر حسن عابدی، جرنل نمبر ۳، پیر محمد شاہ لائبریری ٹرسٹ، مرتبہ پروفیسر بمبئی والا ۲۰۰۳ء۔

(چھ اشعار آب زدہ)

یا تمثیل کشتی نوح نبی است — خاتمۃ الخیر حروف نبی است
.... — بسملہ بر مخزن گنجش طلسم
.... — سبع سموات علی شد تمام

(دیوان الٰہی ص ۱۵۳)

مندرجہ بالا متفرق بیانات کی روشنی میں الٰہی کو کسی ایک مذہبی عقیدہ کا پابند ٹھہرانا مشکل ہے، تاہم بعض اشعار سے ان کے مومن صادق ہونے کی دلیل ملتی ہے

دیوان الٰہی میں معروف حوالے (۱) مہابت خان: الٰہی نے مہابت خان کے نام قصیدے کہے ہیں، صوبہ دار و سپہ سالار قصیدہ نمبر ۶۸ کریم عصر سزاوار خان دریادل کہ سایہ اش ندبد آفتاب را تمکین

(۲) ظفر خان احسن: احسان اللہ احسن بن خواجہ ابو الحسن، منصب دار و صوبہ دار کشمیر ۱۰۳۳ء میں ظفر خان کے خطاب سے نوازا گیا۔

(۳) لشکر خان: صوبہ دکن کا، عہد جہاں گیر میں دیوان مقرر ہوا، انعام و اکرام سے نوازا گیا، ۱۰۲۸ھ میں آگرے کی حفاظت پر مامور ہوا، توزک ص ۳۱۴۔

(۴) ملک عبد اللطیف: ''ملک عبد اللطیف آن گوہر افضال با خاتم کہ فخر دورۂ عباس و جم آن ممبر شد'' قصیدہ نمبر ۲۱ (تزک جہاں گیری میں ایک عالم'' شیخ عبد اللطیف سنبھلی کا تذکرہ ہے؟) توزک ص ۳۱۵۔

(۵) حکیم غزنوی: دید آشنائیہا ی اور ۱۱ کثر ق ر ۲۱۔

(۶) شعر: بشرح مثنوی داند کہ روح مولوی نازد حکیم غزنوی داند کہ ایں شرح از حد میسر شد
۱- شرح مثنوی مولوی معنوی (مولانا رومی)۔ ۲- روح مولوی (مولانا رومی)۔ ۳- حکیم غزنوی؟

(۷) نظام المِلّتِ بیضا قیام الدولہ افضل خان: پہلے جہاں گیر کا میر سامان بنا، (توزک ص ۳۹۹، ۱۰۲۹ھ میں دکن کی فتح کے بعد دیوان مقرر رہا، ص ۳۵۹)۔

(۸) مصرعہ: کہ مداح تو باید انوری را بے سپردارد (فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر انوری ابیوردی) قصیدہ نمبر ۲۳۔

(۹) شعر، ق ر ۲۴، سعد اکبر سعید خان کہ کفش رزق تنہا دہ را ضمان باشد
: سعید خان ولد احمد بیگ، جہاں گیر کا ایک معتبر امیر اور سردار، توزک ص ۳۸۵۔

(۱۰) شعر، ق/۲۹، مسعود سعد وار دعاہای گنم ترا تا کام دل بسہم سعادت کنی شکار (شاعر معروف مسعود سعد سلمان)۔

(۱۱) از فرخی سہ بیت تضمین اد کنم تاگوہر سہ روح مرصع شود ازان (فرخی سیستانی، کلاسیکی فارسی شاعری کا معروف قصیدہ گو شاعر)

(۱۲) شعر: اعظم سعید خان کہ بمنصو بہائے بخت ق/۴۳ دولت مساعد است سعادت مرید تو (سعید خان ولد احمد بیگ، جہاں گیری امیر)

(۱۴) ق/۳۳ ملک الفضل امیر الفضلا قاضی خان: کرد براین حکم گشتہ فلاطون وار (اس امیر کا پتہ نہ چل سکا)

(۱۵) ق/۳۴ شعر: ابو الحسن عضد الدولہ آنکہ در گہ او چو رکن کعبہ بود بوسہ گاہ ہفت اختر (عہد جہاں گیر کا نہایت معتبر امیر ۱۰۳۳ھ میں کابل کا حاکم بنا دیوان کے عہدے پر فائز رہا، تزک ص ۳۶۶

(۱۶) شعر: ق/۳۸ گوہر نمائی تیغ شجاعت سعید کز تیغ او زند گہر ذو الفقار سر سعید خان ولد احمد بیگ کابلی، تزک ص ۳۸۵)

(۱۷) میرزا غازی امان اللہ عادل بود آیت دولت او ہیکل بازوی دول (امان اللہ بن مہابت خان کو جہاں گیر نے ۱۰۳۲ھ میں خانہ زاد خان کے خطاب سے سرفراز کیا، توزک ص ۳۹۱)

(۱۸) ق/۵۱ شرف الدولہ ظفر خان کہ پئے بندگیش حلقہ در گوش نمایند تولد اطفال (ظفر خان، احسان اللہ احسن بن خواجہ ابو الحسن، صوبہ دار کشمیر و ممدوح الٰہی)

(۱۹) ق/۴۷ چو دم زد مرید خاصش سعید خان آمد سیبہ خاص پے احترام او (سعید خان ولد احمد بیگ کابل)

(۲۰) ق/۵۷ نسخہ شعرم الٰہی ہیکل خاقان شود گر شود منظور اوایں مطلع غرای من (خاقانی شروانی کلاسیکی فارسی شاعری کے معروف قصیدہ گو شاعر کی طرف اشارہ)

(۲۱) دیوان ص ۱۶۱ خواجہ آصف بینش دین پرست (خواجہ آصف لاہور کا نایب حاکم، تزک ص ۳۹۳)۔

مثنوی در تہنیت مئے و ساقی:

الٰہی مئے و مینا، جام و سبو، ساقی و میخانہ کے رسیا تھے، الٰہی نے ایک شان دار ساقی نامہ منظوم کیا ہے اور شراب کی تعریف میں ایک خوب صورت قطع کہا ہے، ملاحظہ کیجیے:

بدہ مئے کہ عیش جوانی کند   غم در عدم زندگانی کند
زغم سخت جان گشتہ ام ایں قدر   کہ مغزم بود استخوان دگر
شدم بسکہ خجلت کش عیب جویش   سرم گشتہ زندانی جیب خویش
ضعیفم چناں از ہوائے تو ......   کہ در طبع کابل ادائے نماز
پے دیں نمازش بود نا درست   ولی رو بمحراب دنیا درست
رکوعی کہ مینائے مئے کند   ازان سجدہ مہر گہ وی کند
بیا ای بزہد ریا دادہ دل   ازیں نقش تذویر مشو سادہ دل
بیا ساقی آں ساغر پر شراب   کہ داغست از و چشمۂ آفتاب

(باقی)

سیرۃ النبیؐ کا ایک گمنام مترجم مولوی سبطین احمد
اور ان کا وطن بدایوں

از:- جناب تسلیم غوری بدایونی صاحب ☆

شمس العلما علامہ شبلی نعمانیؒ متوفی ۱۹۱۴ء کی شہرۂ آفاق تالیف سیرۃ النبی کا ملکی اور غیر ملکی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، جن اہل قلم نے سیرۃ النبی کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے ان میں ایک نام مولوی سبطین احمد بدایونی کا بھی ہے مگر افسوس ہے کہ لوگوں کو اس کا پتا نہیں اور اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور علمی خدمات پر کوئی سیر حاصل مقالہ سپرد قلم نہیں کیا گیا، یہ مقالہ اسی کمی کی تلافی کے خیال سے لکھا جارہا ہے لیکن اس سے پہلے ہم ان کے وطن اور خاندان کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

صوبہ اتر پردیش کی مشہور و معروف تاریخی اہمیت کی حامل کمشنری روہیل کھنڈ کا ایک ضلع بدایوں بھی ہے جو اپنی قدامت کی بنا پر تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں سال پہلے سے یہ علاقہ آباد ہے، تاریخ کے اوراق میں یہ علاقہ کبھی بدھ مؤ کے نام سے جانا گیا کبھی بھداون لکھا نام سے یاد کیا گیا اور کبھی بیدامؤ نام سے اس کی پہچان بنی، مسلم عہد میں یہ علاقہ بداؤں نام سے جانا اور پہچانا جاتا تھا، آج کل یہ علاقہ بدایوں نام سے مشہور و معروف ہے، اس علاقے کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عہد سلطنت میں قلعۂ دہلی کے ایک دروازے کا نام بداؤں دروازہ تھا، ہندوستان کے اولین دو سلطان قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش تخت دہلی پر بیٹھنے سے قبل بداؤں کے حاکم رہ چکے تھے، تاریخ کے اوراق ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے چشتیہ سلسلے کے ایک اہم بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیا

☆ ۲۲۴ سرائے جالندھری، بدایوں۔

محبوب الٰہی کی پیدائش بھی اسی بدایوں میں ہوئی تھی، ہندوستان کے سید خاندان کا آخری سلطان سید علاء الدین بدایوں کی آب و ہوا سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے تخت دہلی کو دوسروں کے حوالے کر کے بدایوں کو اپنا مسکن بنایا، اس سلطان کی آخری آرام گاہ آج بھی بدایوں کی عظمت میں اضافہ کررہی ہے، عہد اکبری کا بے باک مورخ ملا عبدالقادر بسیاوری ثم بدایونی جو تاریخ میں البدایونی کے نام سے مشہور ہے، اس کی آخری آرام گاہ بھی بدایوں میں موجود ہے، اس بے باک مورخ نے اپنی علمی پیاس بھی اسی شہر میں بجھائی تھی اور اپنی حیات کے بہت سے ساون یہاں گزارے تھے، دربار عالم گیری کے ایک نامور عالم قاضی محمد جلیس صدیقی حمیدی بھی بدایوں کے فرزند تھے، جنھوں نے مشہور زمانہ مذہبی کتاب فتاویٰ عالم گیری کو مرتب و مدون کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے ایک نامور بزرگ مولانا فیض احمد عثمانی رسوا بدایونی بھی اسی بدایوں کے فرزند جلیل تھے، اس سے بدایوں کی عظمت اور علمی بلند پایگی صاف ظاہر ہے۔

بدایوں میں مسلمانوں کی آمد ۱۱۹۶ء سے بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن یہ سن عیسوی وہ سال ہے جب مسلمانوں کی حکومت اس علاقے پر قایم ہوئی اور دور دراز علاقوں سے جوق در جوق مسلمان یہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے، ان دور دراز علاقوں سے آنے والے خاندانوں میں ایک خاندان ملا عبداللہ مکی (وفات ۳۰-۱۲۲۹ء) کا بھی ہے جو سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے ہندوستان وارد ہوئے اور لاہور میں قیام کیا، اپنی زندگی کی چند بہاریں لاہور میں دیکھنے کے بعد یہ بزرگ ۶۱۰ھ مطابق ۱۴-۱۲۱۳ء میں بدایوں تشریف لائے اور قلعہ بدایوں کے سوتھا دروازہ کے سامنے رہایش اختیار کی، ان کی رہایش کی وجہ سے یہ علاقہ ملا سرائے کے نام سے مشہور ہوا، بعد کو یہ خاندان اندرون قلعہ بدایوں آباد ہو گیا اور اپنے پہلے مسکن کو اپنی آخری آرام گاہوں کے لیے وقف کیا، بدایوں میں اس خاندان کے وارد ہونے کا سال لفظ قریش سے برآمد ہوتا ہے جس کے اعداد ۶۱۰ ہوتے ہیں جو سال ہجری ہے، اس خاندان کے افراد خود کو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزند ارجمند حضرت عبدالرحمٰنؓ کی اولاد بتاتے اور لکھتے آئے ہیں اور اسی نسبت سے خود کو صدیقی لکھتے ہیں، ملا عبداللہ مکی کا خاندان بدایوں میں خوب پھلا پھولا، عہد شیر شاہی میں اس خاندان کے ایک فرد شیخ شمس الدین گزرے ہیں جو شاہی فوج میں ملازم تھے، عہد اکبری

میں بھی یہ بزرگ شاہی فوج میں ملازم رہے، ان کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا اور زاہد ان کا تخلص تھا، انہوں نے بسم اللہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کو سن کر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور زاہد کو جھجھاڑ خاں کا خطاب اور زرِ کثیر عطا کیا تھا، شیخ شمس الدین زاہد نے ملا سرائے میں ۹۵۰ھ مطابق ۴-۱۵۴۳ء میں ایک سہ دری عمارت تعمیر کرائی جو گنبد جھجھاڑ خاں کے نام سے موسوم ہوئی اور آج بھی اسی نام سے موجود ہے اور اپنی خستہ حالت پر آنسو بہا رہی ہے، ۹؍ذی الحجہ ۱۵۸۲ء کو جھجھاڑ خاں کا بدایوں میں انتقال ہوا اور اپنے تعمیر کردہ گنبد کے باہر دفن ہوئے، مشہور زمانہ مورخ ملا عبدالقادر بساوری ثم بدایونی نے اپنی یادگار زمانہ تالیف منتخب التاریخ میں جھجھاڑ خاں کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے، شیخ شمس الدین زاہد لاولد فوت ہوئے البتہ ان کے بھائی شیخ محمد کے صاحب زادے ملا محمد یوسف تھے جن کو شہزادہ نور الدین محمد سلیم کا استاد ہونے کا اعزاز حاصل تھا، شہزادہ سلیم جب جہاں گیر کے نام سے تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے استاد کو معزز عہدے پر فائز کیا اور ان کو بدایوں میں واقع شاہی اوقاف کا متولی بھی بنایا، ان کی یہ تولیت ان کی نسل میں نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہی، اسی لیے شیخ صدیقی عبدالرحمانی کی یہ نسل متولی نام سے بھی مشہور ہوئی، ملا محمد یوسف متولی کی آٹھویں پشت میں ایک بزرگ حکیم نیاز احمد گزرے ہیں جو عربی و فارسی کے عالم و فاضل اور خوش نویس تھے، حکمت میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا، حکیم شیخ نیاز احمد کو اللہ تعالیٰ نے اولادِ نرینہ میں دو فرزند شیخ رضا احمد اور شیخ اعجاز احمد عطا کیے تھے، آخر الذکر شیخ اعجاز احمد کے تین فرزند تھے، شیخ طفیل الدین احمد طفیل بدایونی متوفی ۱۹۴۴ء، شیخ حسنین احمد مورخ بدایونی متوفی ۱۹۵۵ء اور شیخ اکرام احمد شاد بدایونی متوفی ۱۹۶۴ء، شیخ طفیل الدین احمد لاولد فوت ہوئے، ہند و پاک کے مشہور شاعر ثقلین احمد منور بدایونی متوفی ۱۹۸۴ء اور فاروق احمد محشر بدایونی متوفی ۱۹۹۴ء، شیخ حسنین احمد مورخ کے فرزند تھے جب کہ جدید لب و لہجے کے معروف شاعر عرفان صدیقی متوفی ۲۰۰۴ء شیخ اکرام احمد شاد کے حقیقی پوتے تھے، شیخ اعجاز احمد کے تین بیٹیاں بھی تھیں جن میں سے بڑی بیٹی تقدیس النساء عرف پھندا مولوی مجتہد الدین عیش بدایونی متوفی ۱۹۵۵ء کے حبالۂ عقد میں آئیں، عیش بدایونی مولوی امیر مینائی کے شاگرد رشید تھے، دوسری صاحب زادی قدوس فاطمہ مولوی احمد الدین متولی کو منسوب تھیں جو عیش بدایونی کے حقیقی بھتیجے تھے، جب کہ تیسری صاحب زادی تنویر فاطمہ مولوی

شاکر حسین حمیدی کی بیگم تھیں، شہنشاہ طنز و ظرافت دلاور فگار متوفی ۱۹۸۸ء انہیں تنویر فاطمہ کے صاحب زادے تھے۔

حکیم نیاز احمد کے بڑے فرزند شیخ رضا احمد متولی (وفات ۱۹۱۰ء) تھے، یہ بھی اردو ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور شاطر ان کا تخلص تھا، پیشے کے اعتبار سے یہ وکیل تھے، مولوی رضا احمد شاطر کا پہلا عقد منصف کمال الدین متولی کی صاحب زادی سے ہوا تھا جن کے بطن سے ایک بیٹی اقدس النساء عرف گلو یادگار تھیں جو اپنے چچازاد بھائی مولوی طفیل الدین احمد کو منسوب ہوئیں، مولوی رضا احمد کا دوسرا عقد بدایوں کے ایک دوسرے شیخ صدیقی خاندان کے فرد مولوی قاضی نذر اللہ صدیقی حمیدی کی صاحب زادی لمۃ الفاطمہ سعیدہ سے ہوا تھا جو بوجان کے نام سے یاد کی جاتی تھیں، بوجان کے بطن سے شیخ مولوی رضا احمد متولی کے گھر محلہ سوتھا میں یکم اپریل ۱۸۹۸ء کو ایک بچے نے جنم لیا جو آگے چل کر مولوی سبطین احمد کے نام سے جانا اور پہچانا گیا، آج ان ہی مولوی سبطین احمد کا تذکرہ کرنا مقصود ہے، بوجان کے بطن سے دو بیٹیاں مسماۃ زینت فاطمہ اور مسماۃ آمنہ خاتون بھی تھیں، اول الذکر کی شادی مولوی رضی الاسلام ہاشمی وصل بدایونی متوفی ۱۹۴۵ء سے ہوئی تھی جو معروف شاعر عرفان صدیقی اور نیاز صدیقی صاحب کی حقیقی نانی تھیں جب کہ آخر الذکر کا عقد مولوی رئیس الاسلام ہاشمی محمد حامد متوفی ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔

اپنے خاندانی شجرۂ نسب باقیات الصالحات مطبوعہ ۱۸۹۷ء میں مولوی طفیل الدین احمد نے اپنے تایا کی اولاد میں صرف ایک نام غلام برکات درج کیا ہے جب کہ اسی خاندان کے دوسرے شجرۂ نسب شجرۃ الصدیق مطبوعہ ۱۹۲۳ء میں غلام برکات کا نام نہ ہو کر مولوی سبطین احمد کا نام درج ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی رضا احمد کے ایک بیٹے غلام برکات بھی تھے جن کا وصال اوائل عمر میں ہو گیا ہوگا، اسی وجہ سے شجرۃ الصدیق میں ان کا نام نہیں آسکا، یہ علم نہ ہو سکا کہ غلام برکات مولوی رضا احمد کی کون سی بیگم کے بطن سے تھے، اسی خاندان کا ایک اور شجرہ کلمۃ باقیہ بھی ہے جس کے مرتب شیخ کبیر الدین تھے، یہ شجرہ ۱۹۳۷ء میں مولوی مجتہد الدین عیش بدایونی کی نظر ثانی کے بعد شایع ہوا تھا، اس میں بھی غلام برکات کا نام نہ ہو کر مولوی سبطین احمد کا نام درج ہے، واضح رہے مذکورہ تینوں شجروں میں صرف اولاد ذکور کے نام درج ہیں۔

مولوی سبطین احمد چوں کہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے اس لیے اہل خاندان نے ان کو ننھو کہہ کر پکارا، مولوی سبطین احمد کا بچپن خوب لاڈ پیار میں گزرا کیوں کہ یہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ذکور تھے، سونے پر سہاگہ ان کی ننہال میں بھی ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا کیوں کہ ان کی والدہ کے حقیقی بھائی قاضی عبدالحیٔ بے چین بدایونی مولوی سبطین احمد کی پیدائش سے ایک سال قبل ۱۸۹۷ء میں لاولد انتقال کر چکے تھے، مولوی سبطین احمد ابھی بارہ سال کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، اس لیے ان کی ساری کفالت ان کی والدہ نے کی، سبطین احمد نے ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق عربی، فارسی اور اردو میں حاصل کی، انگریزی کی ابتدائی کتابیں اپنے بچا زادے مولوی اکرام احمد شاد صدیقی سے پڑھیں اور انہوں نے ہی ان کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا، مزید تعلیم کے لیے ان کو بدایوں کے اس وقت کے واحد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں سے ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا، چونکہ ان کی والدہ اپنے صاحب زادے کی تعلیم سے مطمئن تھیں اور ان کی علمی لیاقت و ذہانت سے بھی واقف تھیں اس لیے ان کو ہائی اسکول سے آگے کی تعلیم دلانے کی غرض سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل کرایا گیا جہاں ان کی رہایش میکڈانلڈ ہاسٹل میں رہی، علی گڑھ سے سبطین احمد نے ۱۹۱۹ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور بدایوں واپس آگئے۔

جس زمانے میں مولوی سبطین احمد بی۔اے کی ڈگری لے کر وطن واپس آئے، اس عہد میں بدایوں اور شیخو پور کے رؤسا ے انجمن تعلیم مسلمانانِ بدایوں کے تحت بدایوں شہر میں مستن اسلامیہ ہائی اسکول شیخو پور و بدایوں (تعمیر ۱۹۱۶ء) نام سے ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس کے لیے اساتذہ کی ضرورت تھی، حسنِ اتفاق مولوی سبطین احمد شریف النفس اور نجیب الطرفین خاندان کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے، اس لیے اسکول کے ارباب حل وعقد نے ان کو اسکول کے اسٹاف میں شامل کرنے کی حامی بھر لی اور انہوں نے ۱۱ر جولائی ۱۹۱۹ء سے نایب مدرس کی حیثیت سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور تقریباً انتالیس سال اپنی خدمات انجام دے کر اپنی عمر کے ساٹھ سال پورے کرتے ہوئے یکم اپریل ۱۹۵۸ء کو حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج شیخو پور و بدایوں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ (واضح رہے مستن اسلامیہ ہائی اسکول ۱۹۴۴ء میں آنور تحصیل بریلی کی مخیر شخصیت حافظ محمد صدیق متوفی ۱۹۵۰ء کی مالی مدد سے انٹر کالج میں تبدیل ہوگیا تھا، اسی لیے اس کا نام حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج شیخو پور و بدایوں ہوا)، ملازمت کے دوران ہی انہوں نے ۱۹۲۵ء میں اسکول سے چھٹی لے کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے استاد ہونے کی سند بی۔ٹی حاصل کی، کالج کی ملازمت کے دوران کالج کے وائس پرنسپل بھی رہے اور جب ۱۹۴۳ء میں مولوی منصور علی پرنسپل کے عہدے سے مستعفی ہوئے تو مولوی سبطین احمد قایم مقام پرنسپل بنائے گئے، اس عہدے کو جون ۱۹۴۴ء تک زینت بخشی، جب انٹر کالج کے پہلے پرنسپل سید مزمل علی اکبر آبادی نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا تو مولوی سبطین احمد پھر وائس پرنسپل کے فرایض انجام دینے لگے، اس کا اظہار مولوی محمد اقتدار الدین حسین بار ایٹ لا ایم۔ایل۔اے صدر مینیجنگ کمیٹی حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۸ر اگست ۱۹۴۴ء کو اسکول سے کالج بننے کے موقع پر کی تھی، اپنی اس تقریر میں ایم۔آئی حسن مرحوم نے مولوی سبطین احمد کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

" The entire staff and particularly the Vice Principal Mr. Sibtain Ahmad who was offeciating before the new principal arrived and till the end of June1944. as he head of our enistitution worked ceaselessly for months as a band of willing workers."

اردو کے صاحب طرز ادیب و تنقید نگار جناب ویریندر پرشاد سکسینہ صاحب نے اپنی تصنیف بدایوں کے اساتذۂ سخن مطبوعہ ۱۹۹۹ء میں تحریر کیا ہے کہ سبطین صاحب اسلامیہ انٹر کالج بدایوں میں ۲۵ سال تک استاد رہے، موصوف کی یہ بات غلط ہے، میں نے کالج رکارڈ سے مولوی سبطین احمد کی تاریخ جوائنگ اور تاریخ رٹائرمینٹ درج کی ہے جو بالکل صحیح ہے، کالج کی ملازمت کے دوران انہوں نے ہزاروں شاگردوں کو علمی اور اخلاقی درس دیا، ان کے ہزارہا شاگردوں میں ہندو پاک کے ممتاز ادیب پروفیسر ابواللیث صدیقی متوفی ۱۹۹۴ء، شکیل بدایونی متوفی ۱۹۷۰ء، دلاور فگار متوفی ۱۹۹۸ء، پروفیسر ایوب قادری متوفی ۱۹۸۳ء، عرفان صدیقی متوفی ۲۰۰۴ء،

جناب فرخ جلالی صاحب اور جناب ویریندر پرشاد سکینہ صاحب کے اسماء قابل ذکر ہیں، پروفیسر ابواللیث صدیقی، دلاور فگار اور ویریندر پرشاد سکینہ صاحب نے باقاعدہ اپنی تحریروں پر ان سے اصلاح بھی لی تھی، پروفیسر ابواللیث صدیقی نے اپنی شاگردی کے بارے میں یوں اعتراف کیا ہے:

"اسکول کے یوں تو سب ہی استاد میرے لیے شمع ہدایت رہے لیکن ان میں سبطین احمد صاحب مرحوم سرفہرست ہیں، انہوں نے رسمی تدریس کے علاوہ مجھے بہت کچھ دیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، کراچی میں انتقال ہوا اور اس سے چند روز پہلے حاضر ہوکر پیروبانے کی عزت سے سرفراز ہوا"۔

عالمی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار دلاور حسین فگار مرحوم مولوی سبطین احمد سے فیض حاصل کرنے کی سعادت کو ان جملوں میں واضح کرتے ہیں:

"اس دور میں ایک صاحب نظر عالم اور ادیب سبطین احمد سبطین بھی تھے جو اسلامیہ کالج میں استاد تھے، علم و ادب میں ان کو کامل کہا جاسکتا ہے، پاکستان میں انتقال ہوا، ان کے صاحب زادے ابوالاخیار صاحب کراچی میں ممتاز صحافی ہیں، میں نے سبطین صاحب مرحوم کو بھی کچھ غزلیں برائے اصلاح پیش کی ہیں اور انہوں نے شعر کو خوب سے خوب تر بنایا ہے گویا طبع حسرت نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے"۔

مولوی سبطین احمد کے تربیت یافتہ ایک بدایونی ادیب اور بعد کو کالج کو لیگ چودھری صغیر حسن صدیقی متوفی ۲۰۰۴ء نے اپنی کتاب بدایوں کے تابندہ ستارے مطبوعہ ۱۹۸۹ء میں اپنے استاد قبلہ سبطین احمد کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

"قبلہ کا لباس ٹوپی، شیروانی، چھوٹی موری کا ٹخنہ سے اونچا پائجامہ تھا، ہاتھ میں ایک عدد چھڑی قبلہ کا طرۂ امتیاز تھا، ادبی ذوق کے آدمی تھے، اچھے شعر یا ادبی نکات پر تبسم فرمانا قبلہ کی عادت میں شامل تھا، بیکار گفتگو قبلہ کو پسند نہ تھی، کم گوئی قبلہ کا شعار تھا، گفتگو متانت و سنجیدگی لیے ہوتی تھی، قبلہ کو مطالعے کا بے حد شوق تھا اور ان کا یہ شوق آخری وقت تک قائم رہا، قبلہ اردو کے علاوہ عربی و فارسی زبان سے بھی واقف تھے، اگرچہ انگریزی صرف بی-اے تک پڑھی تھی مگر اس میں غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے، قبلہ کا تاریخ ایک امتیازی مضمون تھا، قبلہ کا بدن ضرور چھریرا تھا مگر ٹھوس قابلیت کے مالک تھے، قبلہ کے چہرۂ مبارک پر خشخشی داڑھی بھی تھی اور مونچھ بھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے مگر امامت سے ہمیشہ گریز کیا"۔

۱۹۱۹ء مولوی سبطین احمد کی زندگی میں یادگاری سن رہی کیوں کہ اسی سن میں انہوں نے بی-اے کی سند حاصل کی اور اسی سن میں ان کی ملازمت کی ابتدا ہوئی اور اسی سن میں مولوی سبطین احمد کا عقد بدایوں کے خاندان عباسی ہاشمی میں مولوی سراج الاسلام عباسی متوفی ۱۹۶۰ء کی صاحب زادی عابدہ خاتون سے ہوا جو ۱۹۸۰ء میں فوت ہوئیں، ان کے بطن سے پانچ بیٹے ابوالاخیار، ادریس احمد، خلیل احمد، آل احمد (وفات ۱۸/اپریل ۲۰۰۲ء)، ضیاء احمد اور دو بیٹیاں عابدہ سعیدہ نجمہ زوجہ خواجہ عزیز الدین لکھنوی اور فاطمہ سعیدہ زہرہ زوجہ محمد اظہر الاسلام ہاشمی پیدا ہوئی، آزادی وطن کے بعد یہ سبھی لوگ نوتشکیل شدہ مملکت پاکستان چلے گئے اور وہاں مرحوم آل احمد کے علاوہ سبھی خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں، بدایوں میں مولوی سبطین احمد اکیلے رہ گئے تھے، اولاد کی محبت نے ان کو بھی نقل وطن کرنے پر مجبور کیا اور وہ اپنا آبائی مکان واقع محلہ سوتھا بجھی چوک کو ایک اسلامی درس گاہ کے نام بیع کرکے اپریل ۱۹۶۵ء کے آخری عشرے میں بدایوں کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ کر پاکستان چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، مولانا ضیاء احمد بدایونی متوفی ۱۹۷۳ء کو ۳۱/مئی ۱۹۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۲/مئی کو یہاں (کراچی) پہنچا، اب حقیقی معنی میں بے خانماں ہوں، گھر بیچ ڈالا اور اثاث البیت تباہ ہی کیا۔

نشیمن خود اجاڑا ہے کہ آزادانِ گلشن پر خس و خاشاک کے احساس کا بار گراں کیوں ہو

زندگی میں اس تلخ تجربے کا مزا بھی چکھ لیا، اس بسیط و عریض کرۂ ارض پر ایک انچ مربع زمین بھی نہیں جس کو اپنا کہہ سکوں البتہ دو گز زمین میرے حصے میں ضرور آئے گی مگر اس کو اپنی کہنے والا ہی نہ ہوگا مگر ایک اعتبار سے یہ انقلاب اور نقل مکان کچھ زیادہ گراں نہیں ہے، اب وطن (بدایوں) بھی پردیس معلوم ہونے لگا تھا اور میں خود کو

غریب الوطن سا محسوس کرتا تھا، وہ تو اللہ کا کرم ہے کہ قلم گھسنے کی سکت باقی ہے ورنہ دن
کاٹنا دوبھر ہو جاتا، یہاں بھی وہی حال ہے، گھر کی چہار دیواری میں اسیر پڑا رہتا ہوں،
مشغلے کے طور پر سیرت کی دوسری جلد منگالی ہے، کوئی چالیس صفحے ترجمہ کر چکا ہوں
ساتھ ہی ایک ادارے کے لیے کچھ ترجمے کا کام کر رہا ہوں، آپ یاد آتے ہیں اور کیا
لکھوں، فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے، سو وہ اب کہاں نصیب ہو سکتی ہے''۔

۱۹۶۵ء میں نقل وطن کرنے کے بعد مولوی سبطین احمد کو بدایوں اور علی گڑھ کی یادیں برابر ستاتی رہیں، مگر وہ مجبور تھے کر بھی کیا سکتے تھے، آخر کار وہ دن بھی آگیا جب بدایوں کی اس نابغۂ روزگار شخصیت کے نام اپنے محبوبِ حقیقی سے ملنے کا پروانہ آگیا اور ۲۴؍ اگست ۱۹۷۱ء مطابق ۲؍ رجب ۱۳۹۱ھ بہ روز منگل کو انہوں نے اجل کو اپنے گلے لگالیا اور کراچی پاکستان کی خاک کا پیوند بنے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوگئے، بہ قولِ غالب:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مولوی سبطین احمد کی وفات پر بہت سے شعرانے قطعات تاریخِ وفات کہے تھے، ان میں سے ایک قطعہ یہاں پیش کرتا ہوں جو مولوی ابرار علی صدیقی ابرار بدایونی کی فکر کا نتیجہ ہے، لکھتے ہیں:

قبلہ سبطین احمد ذی جاہ — ماہِ فکر تلامذہ کہ نہفت
پئے تاریخ رحلتش ہاتف — آرزوئے اساتذہ می گفت

۱۳۹۱ھ

مولوی سبطین احمد کو ادبی ذوق وراثت میں ملا تھا، انہوں نے جس خاندان میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اس خاندان میں شعر و ادب کا طوطی بول رہا تھا، حق تو یہ ہے کہ اس عہد کے اہل بدایوں کا مزاج ہی شاعرانہ اور ادیبانہ تھا، ہر تعلیم یافتہ شخص شاعری کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہونا باعث فخر سمجھتا تھا، مولوی سبطین احمد خود لکھتے ہیں:

''میں جب مدرسے کی اونچی جماعتوں میں پہنچا تو وطن اور خاندانی بیماری
اس حد تک مجھ کو لگ گئی کہ جب موقع ملتا مشاعروں میں (جن سے اب جان چھڑاتا ہوں)

ضرور جاتا، کبھی اس بلند آہنگ اور شرارت آمیز واہ واہ میں بھی شریک ہوتا جس کی اب
اتنی ارزانی ہے کہ بڑے بڑے پڑھنے والے کا پتا پانی ہوتا ہے، اب تو سامعین پہلے یہ
تو لیتے ہیں تغزل اور ترنم کے علاوہ تحمل بھی ہے یا نہیں''۔ (غم فروزاں)

بدایوں میں کچھ خاندان ایسے بھی ہیں جن میں ایک ہی وقت میں تین تین نسلوں نے شعر و ادب کی آب یاری کی ہے، ان خانوادوں میں شاہ ظہیر احمد ظہیرؔ متوفی ۱۹۴۳ء، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی متوفی ۲۰۰۳ء، مولوی سبطین احمد متوفی ۱۹۷۱ء اور جناب طارق سبزواری صاحب کے خاندان قابل ذکر ہیں، اس اعزاز پر ان کے اہل خاندان کو بہ جا طور پر فخر ہے گویا ع

سَو سال سے ہے پیشۂ اجداد شاعری

مولوی سبطین احمد کے حقیقی ماموں مولوی عبدالحئی بیچینؔ متوفی ۱۸۹۷ء، داغؔ دہلوی کے شاگرد رہ چکے تھے، ان کے چچازاد بھائی اور بہنوئی مولوی طفیل الدین احمد صاحب تصانیف تھے، انہوں نے برکاتِ مارہرہ نام سے بزرگان مارہرہ کے حالات لکھے تھے جو مطبع نول کشور، لکھنؤ سے شایع ہوئی، یہ مولوی طفیل الدین احمد کی قابل قدر تالیف ہے، ان کے دوسرے چچازاد بھائی مولوی اکرام احمد شادؔ، مولانا احسن مارہروی متوفی ۱۹۴۰ء کے تلامذہ میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے، تیسرے چچازاد بھائی مولوی حسنین احمد مورخ تلامیذ الرحمٰن کا درجہ رکھتے تھے، مولوی سبطین احمد کے والد مولوی رضا احمد بہ اعتبار پیشہ وکیل تھے اور بلند شہر سہسوان میں وکالت کرتے تھے، اس کے باوجود ادبی شوق اور ذوق کے مالک تھے اور سید حسین کیفؔ دہلوی کے تلامذہ میں اپنا الگ مقام رکھتے تھے، بھلا ایسے ادبی ماحول میں پرورش پانے والا بچہ خود کو کب تک اور کیسے الگ رکھ سکتا تھا، جس بچے کی ہر سانس میں شعری لئے جاری ہو، جو ہر بات پر اشعار سنتا ہو وہ بچہ شاعر و ادیب نہ بنتا تو اور کیا بنتا اور ہوا بھی ایسا ہی، مولوی سبطین احمد میدان ادب میں داخل ہوگئے، سونے پر سہاگہ علی گڑھ کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو خوب جلا بخشی، علی گڑھ قیام کے دوران ہی ان کے افسانے اور ادبی و تاریخی مضامین علی گڑھ میگزین، ماہ نامہ معارف اعظم گڈھ، ماہ نامہ نیرنگ خیال لاہور اور ماہ نامہ عالم گیر لاہور میں شایع ہونے لگے تھے، جب علی گڑھ سے بدایوں آگئے تو ایک پختہ قلم کار ہو چکے تھے، اسی لیے مولوی نظام الدین حسین نظامیؔ بدایونی کے ہفت روزہ ذوالقرنین، مولوی

وحید احمد مسعود کے ماہ نامہ نقیب اور بدایوں ہی سے شایع ہونے والا ماہ نامہ نقاش میں ان کے مضامین شایع ہونے لگے، ان کے زیادہ تر مضامین تاریخی ہوتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو ملکی اور عالمی تاریخ سے دل چسپی تھی، ان کے مضامین ۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۱ء تک شایع ہونے والے ہندوپاک کے اخباروں اور رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں، اگر اردو کا کوئی اسکالر ان کے مضامین کو یک جا کر کے شایع کردے تو یہ بڑے کام کی چیز ہو، مولوی سبطین احمد میں انکساری اور طبیعت میں خاموشی بلا کی تھی، وہ نام ونمود سے دور رہتے تھے، اسی لیے انہوں نے اپنا کوئی تخلص اختیار نہیں کیا، وقت ضرورت اپنے نام کا جز سبطین ہی تخلص کی جگہ استعمال کرلیا کرتے تھے، مشاعروں میں شرکت بہت کم کرتے تھے، نام ونمود سے عدم دل چسپی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ انگریز حکومت نے ان کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے ان کو تحصیل دار بنانے کی پیش کش کی، مصلحتاً فوراً جواب نہ دے کر ایک ہفتے بعد معذرت کے ساتھ لکھا کہ بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور تحصیل دار بننے پر راضی نہیں ہوئے۔

مولوی سبطین احمد کو ادبی ذوق اس حد تک تھا کہ وہ اپنے تلامذہ کو بھی اس جانب راغب کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے، انہوں نے اسلامیہ اسکول کے طلبا کو ادبی ذوق میں باندھنے کے لیے ۱۹۲۶ء میں ایک ماہ نامہ چمن جاری کرایا جس کے مدیر خود نہ بن کر اپنے ساتھی ماسٹر شبیر الحسن ایم-اے (علیگ) کو بنایا البتہ اس کی ادارت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لی، اس رسالے کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۲۶ء میں منظر عام پر آیا، اس رسالے میں اس وقت کے صف اول کے اہل قلم کا کلام شایع ہوتا تھا، رسالہ چمن کے چوتھے شمارے بابت جون، جولائی ۱۹۲۶ء سے مدیر کی حیثیت سے ان کا نام بھی شایع ہونے لگا، مگر بہت جلد ہی یہ رسالہ مرحوم ہوگیا، حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج کے ارباب حل وعقد نے جب سالانہ میگزین نکالنا شروع کیا تو اس کی چیف اڈیٹری کی ذمہ داری بھی مولوی سبطین احمد کے سر رہی، اس دوران اسلامیہ کالج میگزین کا ۳-۱۹۵۲ء کا شمارہ بدایوں کے اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے، اس شمارے میں بدایونی شعرا کے خود نوشت حالات اور دس دس اشعار کو مع تصاویر شایع کیا گیا ہے، یہ بدایوں کے زندہ شعرا کا پہلا تذکرہ ہے مگر وا رے

انکساری اور بے نیازی کہ استاد شاعر ہوتے ہوئے بھی شعرا کی فہرست میں ان کا نام شامل نہیں ہے، مولوی سبطین احمد کے اعلا کردار کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں مولوی سید طفیل احمد منگلوری متوفی ۱۹۴۶ء نے ان کو اپنے سٹی اسکول علی گڑھ کا پرنسپل بنانا چاہا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس عہدے کو قبول کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں اپنی زندگی کا قیمتی وقت اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں میں صرف کرچکا ہوں اب وہاں جاکر اپنی تنخواہ کا حق ادا نہ کرسکوں گا۔

مولوی سبطین احمد اسلامی تہذیب کا نمونہ تھے، ان کو بزرگان دین اور وطن کے اکابر سے گہری عقیدت تھی، اسی عقیدت کی بنا پر انہوں نے مشہور زمانہ فارسی شعرا ضیاء الدین نخشبی اور شہاب الدین مہمرہ کے مزارات کو جو وقت کے بے رحم ہاتھوں شکستہ ہوگئے تھے از سر نو تعمیر کرایا اور ان پر کتبے نصب کرائے، ملا عبدالقادر بسیاروی ثم بدایونی کی قبر کی تلاش اور اس کی تعمیر ومرمت بھی مولوی سبطین احمد کی تحریک پر شہر کے عمایدنے کرائی، ان کی ذات بدایونی شعرا وادبا کی آخری آرام گاہوں کے متعلق وسیع معلومات کا خزانہ تھی، وہ ان پر کتبے بھی لگوانا چاہتے تھے لیکن وسایل کی کمی اور ملک کی تقسیم کے سبب ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر پروفیسر آل احمد سرور متوفی ۲۰۰۲ء جب ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو کے صدر بنے تو انہوں نے شعبہ کی جانب سے شایع ہونے والی تاریخ اردو ادب کے مرتبین کی مدد کرنے کے لیے جن اصحاب قلم کا انتخاب کیا ان میں ایک نام مولوی سبطین احمد کا بھی تھا کیوں کہ پروفیسر سرور ان کی لیاقت اور علمی صلاحیت کے قایل تھے، پروفیسر سرور کی ایما پر مولوی سبطین احمد علی گڑھ چلے گئے اور تاریخ ادب اردو کی تیاری میں دن رات ایک کردیا، ۱۹۶۲ء میں اس کی پہلی جلد منظر عام پر آئی لیکن اس کے پروف اچھی طرح نہ پڑھے جانے کے سبب اس میں کچھ اغلاط جگہ پاگئیں جس پر ادبی حلقوں میں لے دے ہوئی اور پروفیسر سرور کو یہ جلد واپس لینی پڑی اور دل برداشتہ ہوکر انہوں نے اس اسکیم کو ہی ختم کردیا، اگر تاریخ اردو ادب کی مکمل جلدیں شایع ہوجائیں تو اردو خزانے میں ایک کوہ نور جگہ پالیتا، مولوی سبطین احمد اس اسکیم کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء میں بدایوں واپس آگئے۔

مولوی سبطین احمد افسانہ نگار، مضمون نگار اور شاعر ہونے کے علاوہ پختہ قلم مترجم بھی تھے،

انہیں اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر عبور حاصل تھا، ان کی ۷۳ سالہ زندگی میں جو ادبی کارنامے منظر عام پر آئے وہ درج ذیل ہیں:

۱- انگلستان کی کہانی معاصرین کی زبانی، مطبوعہ ۱۹۲۹ء، نظامی پریس بدایوں۔

۲- ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، مطبوعہ ۱۹۳۵ء، نظامی پریس بدایوں۔

۳- خلافت اور سلطنت، مطبوعہ ۱۹۳۹ء، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

۴- ترجمہ انگریزی سیرۃ النبیؐ حصہ دوم (مولانا شبلی نعمانی) مطبوعہ ۱۹۷۱ء، جمعیت الفلاح کراچی پاکستان۔

۵- بدایوں کا جغرافیہ، ب ت۔

۶- اردو قواعد، ب ت۔

۷- خس و خاشاک شعری مجموعہ، مطبوعہ ۱۹۵۹ء، نظامی پریس بدایوں۔

مولوی سبطین احمد کی مطبوعہ مذکورہ کتب میں سے سیرۃ النبی حصہ دوم ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جس کا تذکرہ کرنا یہاں مقصود ہے، یہ مولوی سبطین احمد کا وہ کارنامہ ہے جو انہوں نے بہ زبانِ انگریزی انجام دیا اور خود کو امر کرلیا، یہ ترجمہ ہی میرے اس مضمون کا محرک ہے، دراصل چند سال قبل ماہ نامہ معارف کے کسی شمارے میں علامہ شبلی نعمانی متوفی ۱۹۱۴ء کی مشہور زمانہ تالیف سیرۃ النبی کے دوسری زبانوں میں ہوئے ترجموں پر ایک محققانہ مضمون شایع ہوا تھا، فاضل مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں مولوی سبطین احمد کے ترجمے کا ذکر نہیں کیا تھا، اس مضمون کو پڑھ کر میں نے معارف کے اڈیٹر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں میں نے اپنے موقف کا اظہار کیا تھا، موصوف نے میرے خط کے جواب میں مجھے دعوت دی تھی کہ میں اس ترجمہ کے بابت کچھ لکھوں لیکن اس وقت تک مولوی سبطین احمد کا کیا ہوا ترجمہ میری دست رس میں نہیں تھا اس لیے مجبوراً میں خاموش ہوگیا، حسن اتفاق اسی سال یا اس سے اگلی سال مولوی سبطین احمد کے صاحب زادے جناب ادریس احمد صاحب اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان سے بدایوں آئے تو میں نے ان سے سیرۃ النبی کے ترجمہ کا ذکر کیا، موصوف نے کہا کہ اس کے کچھ نسخے ان کے پاس کراچی میں محفوظ ہیں، بات آئی گئی ہوگئی، فروری ۲۰۰۴ء میں موصوف ایک

مرتبہ پھر اپنے عزیزوں سے تجدید ملاقات کرنے ہندوستان آئے تو میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ میرے لیے اس ترجمہ کا ایک نسخہ لیتے آئے نہ صرف میرے لیے بلکہ ایک نسخہ انہوں نے دارالمصنفین اعظم گڈہ کی لائبریری میں داخل کرنے اور ایک نسخہ مادر درس گاہ علی گڑھ کی آزاد لائبریری کے لیے بھی مجھے دیا جن کو میں نے مذکورہ کتب خانوں میں داخل کرادیا، میں نے سیرۃ النبی کا یہ ترجمہ آنکھوں سے لگایا اور مطالعے میں مصروف ہوگیا چوں کہ میں سیرۃ النبی کے کل حصے پڑھ چکا ہوں اس لیے یہ ترجمہ سمجھنے میں کہیں دشواری نہیں ہوئی، یہ ترجمہ پڑھتے ہی مجھے مدیر ماہ نامہ معارف کی دعوت یاد آگئی اور میں نے ایک مضمون لکھنے پر خود کو تیار کیا۔

۴۳۷ صفحات پر مشتمل سیرۃ النبی کے دوسرے حصے کا یہ ترجمہ ۱۹۷۱ء میں ادارہ جمعیت الفلاح کراچی پاکستان سے شایع ہوا ہے، اس ترجمے کا اصل متن ۳۷۹ صفحات پر مشتمل ہے جب کہ باقی صفحات انڈکس، ضروری مندرجات اور دیگر معلومات کے لیے وقف ہیں، انٹروڈکشن عنوان سے مولوی سبطین کا تحریر کردہ ایک مضمون ہے جس کے آخر میں ۲۰ رجنوری ۱۹۷۱ء درج ہے، اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں شایع ہوئی ویسے کتاب میں کسی جگہ بھی سن اشاعت درج نہیں ہے۔

سیرۃ النبی کا پہلا حصہ اردو زبان میں ۱۹۱۸ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا تھا، اس ترجمہ کی بنیاد یہی پہلا اڈیشن ہے حالانکہ مولوی سبطین احمد نے دونوں حصوں کا ترجمہ کیا تھا مگر شایع صرف دوسرا حصہ ہوا، پہلا حصہ شایع ہوا بھی تو کس کے نام سے یہ علم میں نہ آسکا، ہوسکتا ہے کہ ماسٹر طیب بخش کے نام سے جو ترجمہ شایع ہوا وہ یہی ترجمہ ہو جو مولوی سبطین احمد نے کیا تھا، کیوں کہ مولوی سبطین احمد نے اپنا کیا ہوا ترجمہ ماسٹر طیب بخش کو نظر ثانی کے واسطے دیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

مولوی سبطین احمد نے سیرۃ النبی کو انگریزی قالب میں ڈھالنے کا ارادہ اس وقت بنالیا تھا جب وہ ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ سے وطن واپس آئے تھے، خود کو مشغول رکھنے کے لیے انہوں نے یہ عظیم کام کرنا شروع کیا اور اس میں وہ کامیاب ہوئے، ۳ رفروری ۱۹۶۵ء کو لکھے مولوی ضیاء احمد بدایوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بدایوں تو آپ آتے ہی نہیں خیر دعائے خیر میں یاد رکھیے چوں کہ اسی ماہ میں انشاء اللہ ترک وطن کرنے والا ہوں، اس لیے اب شاید ملاقات ہو تو جب ہی کہ پاکستان

آپ پہونچیں، قلیس صاحب کو سلام پہونچا دیجیے، یہ سن کر آپ کو مسرت ہوگی کہ سیرۃ النبی
جلد اول کا ترجمہ ختم ہو چکا اب نظر ثانی کر رہا ہوں"۔

اپنے ۲۰ رفروری ۱۹۶۵ء کو لکھے ایک خط میں ضیاء احمد بدایونی کو پھر لکھا ہے:
"سیرت کا ترجمہ ختم کرنے کی اطلاع جوش مسرت میں لکھ گیا مگر ابھی کام باقی
ہے، اعلام کی انگریزی تجا اکثر فیصلہ طلب ہے، پھر بعض اصطلاحات ہیں مثلاً گواہ عادل،
راوی ثقہ، احادیث کی اقسام مثلاً منکر احاد حسن وغیرہ، سردست جو سمجھ میں آیا ہے ترجمہ
کردیا ہے مگر اب ضرورت ہے کہ ان اصطلاحات کے لیے معین الفاظ لائے جائیں، آپ
سے رجوع کرنے کا ارادہ ہے بہر حال اپنی بساط اور اہلیت سے قطع نظر کر کے ایک جرأت
رندانہ کر گزرا ہوں معلوم نہیں اہل نظر کے سامنے آئے تو قابل التفات ٹھہرے یا نہیں"۔

یہ تھی سیرۃ النبی کے پہلے حصے کی روئیداد جو دوسرے قلم کاروں کے لیے کچا حال ثابت ہوا،
اب ذرا دوسرے حصے کے متعلق بھی کچھ پڑھ لیجیے، مولانا ضیاء احمد کے نام ۳۱ رمئی ۱۹۶۵ء کو لکھا
خط آپ اوپر پڑھ چکے ہیں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مشغلے کے طور پر سیرت کی دوسری جلد
منگالی ہے کوئی چالیس صفحے ترجمہ کر چکا ہوں اپنے ایک اور خط میں پروفیسر ضیاء احمد کو لکھتے ہیں:
"اپنا حال یہ ہے کہ قید حیات تنہائی میں بدل گئی ہے جو قریب ہیں وہ نا آشنا
اور جو آشنا ہیں وہ میلوں دور، وقت گزاری کے لیے شبلی کی دوسری جلد اٹھالی ہے، ۴۴۰
صفحات ہیں، اب کوئی ۷۰ باقی رہ گئے ہیں مگر اس جلد سے سخت مایوسی ہوئی تکرار ناگوار اور
کہیں کہیں بیان یا تشنہ یا تضاد کا حامل نظر آیا، بیسیوں مقامات حواشی چاہتے ہیں، اعلام کا
صحیح تلفظ ہی کیا کم تھا کہ یہ مشکلات اور سامنے آگئیں جو میرے بس کی چیز نہیں"۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن یہ مولانا ضیاء احمد نے اپنی کتاب مکتوبات میں
۳۱ مئی ۱۹۶۵ء والے خط کے بعد شامل کیا ہے اس لیے واضح ہے کہ یہ اس کے بعد کا ہے، ۱۵ر
اپریل ۱۹۶۶ء کا تحریر کردہ یہ خط اور پڑھ لیجیے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ دوسری جلد کا ترجمہ پورا
ہوگیا، لکھتے ہیں:

"خالی بیٹھا ہوں ابھی تک جلد دوم (سیرۃ النبی) سے مصروف رہتا تھا، وہ

بھی ختم کرلی تو اب ذرا ستا رہا ہوں مگر اس جلد کو بڑی مشاطگی درکار ہے جس کی اہلیت
نہیں ذرا دم لے لوں تو جو کچھ بن پڑے گا کروں گا"۔

یہ ہیں وہ مستند حوالے جو یہ اعلان کر رہے ہیں کہ سیرۃ النبی کے حصہ اول اور حصہ دوم کو
انگریزی جامہ مولوی سبطین احمد بدایونی نے پہنایا تھا جس کا صرف دوسرا حصہ ان کے نام سے
شایع ہوا، ممتاز محقق و ریٹائرڈ ریڈر شاد سکسینہ صاحب نے بدایوں کے اساتذۂ سخن میں لکھا ہے:

"ایک مترجم کی حیثیت سے بھی سبطین صاحب کا مرتبہ بہت بلند تھا، علامہ شبلی
نعمانی کی کتاب سیرۃ النبی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس کا پہلا حصہ شایع ہو چکا ہے"۔

سکسینہ صاحب نے سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہوئے یہ بات لکھ دی جو بالکل غلط ہے،
سیرۃ النبی حصہ دوم کا انگریزی ترجمہ میرے پیش نظر ہے، یہ ترجمہ کتابی صورت میں جمعیت الفلاح
ادارے کی جانب سے شایع کیا گیا ہے، اس ادارے کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر امیر حسن صدیقی متوفی
۱۹۷۱ء تھے، یہ وہی ڈاکٹر امیر حسن صدیقی تھے جن کے پی-ایچ-ڈی مقالے کو مولوی سبطین احمد
نے اردو کا جامہ پہنایا تھا اور یہ ترجمہ خلافت و سلطنت نام سے ۱۹۳۹ء میں مولوی سید سلیمان ندوی
متوفی ۱۹۵۳ء کے مقدمے کے ساتھ معارف پریس اعظم گڈھ سے شایع ہو چکا ہے جس کا ایک نسخہ
دارالمصنفین کی لائبریری میں محفوظ ہے، ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مولوی سبطین احمد کے علمی تبحر کے قائل
تھے، اسی لیے انہوں نے ان کے کیے ہوئے سیرۃ النبی کے ترجمہ کو اپنے ادارے سے شایع کیا جس
کے متعلق ادارے کے صدر ڈاکٹر آئی-ایچ-قریشی لکھتے ہیں:

" The first valume was translated by my late friend
Mr. Fazlur Rahman a former minister in the Governament
of Pakistan and published in two parts by the Pakistan
Historical Sociaty. This is the translation of the second valume
and deals with the last three years of the Prophet's life".

اس ترجمے میں مولوی سبطین احمد نے اپنے جن دوستوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کیا ہے ان میں
مولانا ضیاء احمد بدایونی کا نام نامی بھی شامل ہے، جنہوں نے مولوی سبطین احمد کی بہت مدد کی تھی، ترجے

کے اقتباسات پیش کرنا یہاں میرا مقصد نہیں، میرا منشا صرف یہ دکھانا تھا کہ سیرۃ النبی جیسی مشہور زمانہ کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والوں میں ایک نام مولوی سبطین احمد کا بھی ہے جن کو لوگ خاص کر اہل علم و قلم بھولے ہوئے سے ہیں، امید ہے اس مضمون سے اس کمی کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔

امدادی کتب:

۱- باقیات الصالحات، مرتب مولوی انصار حسین زلالی، مطبوعہ ۱۸۹۷ء۔

۲- تاریخ بنی حمید، مرتب مولوی انشاء اللہ حمیدی، مطبوعہ ۱۹۱۷ء۔

۳- شجرۃ الصدیق، مرتب مولوی محمد رضی الدین تنویر قادری، مطبوعہ ۱۹۲۳ء۔

۴- کلمۃ باقیہ، مرتب شیخ کبیر الدین، مطبوعہ ۱۹۳۷ء۔

۵- غم فروزاں، مرتب نیاز احمد نیاز صدیقی، مطبوعہ ۱۹۶۴ء۔

۶- مکتوبات، مرتب مولوی ضیاء احمد بدایونی، مطبوعہ ۱۹۶۷ء۔

۷- بدایوں کے چند ادبا شعرا، مرتب مبشر علی صدیقی، مطبوعہ ۱۹۸۲ء۔

۸- بدایوں کے تابندہ ستارے، مصنف چودھری صغیر حسن صدیقی، مطبوعہ ۱۹۸۹ء۔

۹- بدایوں کے اساتذۂ سخن، مصنف ویریندر پرشاد سکسینہ، مطبوعہ ۱۹۹۹ء۔

۱۰- صدر رنگ شعری مجموعہ، مولوی ابرار علی صدیقی ابرار بدایونی، مطبوعہ ۱۹۸۰ء۔

۱۱- جامع انساب شرفائی نجیب الطرفین بدایوں، مرتب مولوی غلام شبیر قادری متوفی ۱۹۲۷ء، غیر مطبوعہ۔

۱۲- خواب باقی ہیں خودنوشت، پروفیسر آل احمد سرور، مطبوعہ ۲۰۰۰ء، دوسرا اڈیشن۔

رسائل:

۱- ہفت روزہ ذوالقرنین، بدایوں کا بدایوں نمبر، مدیر مولوی احید الدین نظامی، مطبوعہ اپریل ۱۹۵۶ء۔

۲- مجلہ بدایوں کراچی پاکستان، فروری ۱۹۹۱ء سے جنوری ۲۰۰۴ء تک کے شمارے۔

۳- سالانہ رپورٹ، حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج، شیخوپور بدایوں، بابت ۳-۱۹۵۲ء، مرتب مولوی محمد اسرار احمد سکریٹری کالج۔

☆☆☆

آگرہ کی خاتون شاعرات

از:- ڈاکٹر سید اختیار جعفری☆

ہندوستان کا سابق دارالسلطنت آگرہ (یادش بخیر آگرہ......) علم و ادب کا بھی عظیم مرکز رہا ہے، اردو زبان کی تشکیل و ارتقا میں بھی آگرہ کا نمایاں حصہ ہے، جس دور میں کہ اردو زبان فارسی سے منفرد حیثیت اختیار کر رہی تھی، علم و ادب کا مرکز آگرہ ہی تھا، اکبرآباد نہ صرف مستقبل کی اردو زبان کی شیرینی، موسیقیت اور لطافت کا گہوارہ رہا بلکہ اردو شاعری کے شمالی ہند میں آغاز کا سہرا آگرہ کے ہی سر ہے، تحقیقی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل عہد سکندر لودی میں شروع ہوئی، جب کہ دارالسلطنت آگرہ تھا، اردو زبان نے ادبی حیثیت مغلیہ عہد کے وسط اور اوائل میں اختیار کرنا شروع کی، یہ دور جو ہمایوں، اکبر، سلیم جہاں گیر اور شاہ جہاں پر مشتمل ہے، دراصل اردو زبان و ادب کی ترویج کا دور ہے اور اس کا سلسلہ بھی آگرہ سے ہی شروع ہوا۔

اردو زبان کے سب سے پہلے باقاعدہ مصنف و ادیب اور شاعر سراج الدین علی خان آرزو آگرہ کے ہی تھے، ان کے بعد کے اساتذہ میں قطب الدین باطن، نیاز علی پریشاں، ڈپٹی امداد علی، میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں، ان کے بعد کے دور میں اردو زبان کے خدائے سخن میر تقی میر، خدائے نظم نظیر اکبرآبادی اور ناخدائے سخن مرزا غالب کا تعلق بھی آگرہ سے ہی ہے، خان آرزو سے لے کر اس طبقۂ دوم تک آگرہ میں کم از کم تین درجن قد آور صاحب علم و قلم کے نام ملتے ہیں۔

ایک طرف جہاں اس دور میں فارسی کا دور دورہ تھا وہیں اردو شاعری بھی پر پرواز تول رہی تھی، مزے کی بات یہ ہے کہ اس عہد میں متعدد شاعرات نے بھی شاعری کے گیسو سنوارنے میں

☆ خیراتی ٹولہ، تاج گنج روڈ، آگرہ، ۲۸۲۰۰۱۔

نمایاں حصہ لیا، یہ خاتون شاعرات کہیں صوفیانہ لباس میں جلوہ افروز ہوتی ہیں تو کہیں شاہد بازار کو ٹھے آباد کرنے والی نظر آتی ہیں لیکن ہمارے ادبی مورخین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا، بیشتر شاعرات کے نہ صرف کلام معدوم ہوگئے بلکہ کتنی ہی ایسی آبروئے غزل تھیں جن کے نام تک صفحۂ تاریخ سے ناپید ہوگئے، تاہم چند اہم شاعرات ایسی بھی خوش قسمت تھیں جن کا تذکرہ برائے نام ہی سہی تاریخ میں کہیں نہ کہیں محفوظ رہ گیا، دارالسلطنت اکبرآباد کی ایسی چند منتخب خاتون شاعرات کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔

۱-بہتی اکبرآبادی: یہ آگرہ کی باشندہ تھیں، ۱۲۹۳ھ میں زندہ تھیں، نمونہ میں صرف ایک شعر دستیاب ہوا ہے:

دنیا کے لوگ دیکھنے والے ہوا کے ہیں بہتی ضرور چاہیے اسباب ظاہری

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۱۹، مطبع نول کشور لکھنؤ)

۲-بیگم: تارا بیگم نام تھا، اکبرآباد کے محلے اعظم گنج میں ۱۲۰۰ھ میں قیام کرتی تھیں، یہ شعر دستیاب ہوا ہے:

رکھتا ہے سو بہار کی اک یہ بہار پیٹ کیوں وصل میں چھپاتا ہے تو ہم سے یار پیٹ

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۲۵، تذکرۂ شاعرات از ندیم اکبرآبادی، ص ۱۱)

۳-پری: بچن جان نام تھا، آگرہ کی طوائف تھی، منشی فدا حسین امیر کی شاگردہ تھی، فارسی و اردو دونوں میں ذوق سخن تھا، نمونۂ کلام:

پیچ کی لیتا ہے تو سنبل عبث گیسو پہ پیچ جاناں کے حضور
ہے خیال گیسو و سنبل عبث سلسلہ زنجیر کا اچھا نہیں

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۳۲)

۴-پکھراج: پکھراج بیگم نام تھا، اکبرآباد میں پیدا ہوئیں، شادی کے بعد اٹاوہ سکونت ہوگئی تھی، اردو میں شعر کہتی تھیں، اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدہ اور پاکیزہ طبیعت پائی تھی، کلام میں آمد نظر آتی ہے، نمونۂ کلام:

جب بگڑتی ہے کوئی بات بنا دیتے ہیں ہمیں ہر طرح ٹھہرتے ہیں خطاوار ان کے

خواب میں سیر کیا کرتی ہیں آنکھیں ان کی جب وہ سوتے ہیں تو جادو کو جگا دیتے ہیں
ساتھ لے جاتے غم یار نہ کیوں کر پس مرگ ایسے بے زاد سفر قصد سفر کیا کرتے
بار اٹھ سکتا نہیں موئے کمر کا ان سے پھر وہ شمشیر گراں زیب کمر کیا کرتے
یہ ملاحت رخ دلکش کی کہاں سے لاتے ہمسری تجھ سے بھلا شمس و قمر کیا کرتے
ساتھ ہم لے گئے سرمایہ عدم کو اپنا درد دل دیتے کے سوز جگر کیا کرتے
جدا نہ غم سے رہا زیر آسماں کوئی بچا نہ ہاتھ سے اس پیر کے جواں کوئی
دنیا میں مثل خواب ہماری حیات ہے کیوں کر خیال یار نہ پیش نظر رہے
تاریکی عمل سے کیا گور میں مقام منزل میں شب ہوئی تو سرا میں اتر رہے
پکھراج بعد مرگ بھی غم ساتھ لے چلو بہتر ہے پاس اپنے جو زاد سفر رہے

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۳۳)

۵-تصویر اکبرآبادی: آگرہ کی باشندہ تھیں، میر و مصحفی کی تقلید اشعار میں کہتی تھیں، میر کی دہلی روانگی کے وقت میں کھڑکی کالے خاں کے عقب میں اپنی سسرال میں قیام پذیر تھیں، غالباً قطب الدین باطن اکبرآبادی کی شاگرد تھیں، ابتداً باطن نے ہی بغیر نام و نشان اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ندیم اکبرآبادی کے مختصر تذکرۂ شاعرات میں اسے بوضاحت اکبرآبادی قرار دیا گیا ہے، چوں کہ کہیں سے تصدیق یا تکذیب نہیں ہوئی اس لیے اسے شامل کیا جاتا ہے، نمونۂ کلام:

چل ہوا کھانہ صبا اس دل دلگیر کو چھیڑ کیا مزہ پائے گی تو غنچۂ تصویر کو چھیڑ
محبت اب تلک رکھتی ہے یہ تاثیر مجنوں کی کہ بن لیلیٰ نہیں کھنچتی کہیں تصویر مجنوں کی

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۳۷، تذکرۂ جدید شاعرات از ندیم اکبرآبادی، ص ۲۱)

۶-ثنا: شرفائے اکبرآباد میں اور صاحب عفت و عصمت تھیں، کلام کا نمونہ:

زاہدا توبہ کی جلدی کیا ہے یہ بھی کرلیں گے جو فرصت ہوگی

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۳۹)

۷-جمعیت: عیسائی دوشیزہ تھیں، ان کی والدہ یا نانی ہندوستانی تھیں اور باپ انگریز میجر آر جسٹن سے شادی ہوئی تھی، آگرہ میں قیام تھا، میجر آر جسٹن سے کئی لڑکیاں پیدا ہوئیں، جو

سب کی سب یورپین افراد سے منسوب ہوئیں، جمعیت ایک نہایت ذکی اور طباع عورت تھیں، برج بھاشا میں ان کی ہولیاں، دادرے، ٹھمریاں اور پٹہ وغیرہ موجود تھیں، انگلش طرز معاشرت کی وجہ سے بے حجابی، بے تکلفی تھی، فارسی میں بھی عمدہ ذوق تھا، موسیقی میں کامل مہارت حاصل تھی، اردو میں بھی وافر مقدار میں کلام چھوڑا، ندیم کے مطابق ایک دیوان "درد" کے نام سے مرتب کیا تھا جس میں قریب سوا تین سو غزلیں تھیں، بعد میں اس سرمایہ کا پتا نہیں کیا ہوا، نمونۂ کلام۔

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے — اس واسطے رہی ہوں میں مضطر کئی دن سے
مقسوم کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احساں — رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے
خدا کے روبرو جانا ندامت مجھ کو بھاری ہے — کوئی نیکی نہ بن آئی اسی کی شرمساری ہے

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۴۲)

۸- حسینؔ: اختر جان نام تھا اور حسین تخلص، نام کی طرح شکل بھی حسین تھی اور آگرہ میں قیامت برپا کر رکھی تھی، بازار کی زینت بڑھانے والی شاہد باز تھی، اصلی وطن جے پور تھا، آگرہ کو وطن ثانی بنایا تھا، کلام:

جس وقت تک وہ بزم میں پیش نظر رہے — ہم اپنا دونوں ہاتھوں سے تھامے جگر رہے
صحرا نوردیوں کو بہانہ تو خوب ہے — اچھا ہے سر میں زلف کا سودا اگر رہے
جلادِ تیغ ناز کو جس دم علم کرے — شرط نیاز یہ ہے کہ قدموں پہ سر رہے

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۵۵)

۹- دلبرؔ: چھوٹی بیگم دلبر اکبرآبادی آگرہ میں طوائف تھی، تذکرۃ الشاعرات کے مصنف نے اس کو نہ اس طبقہ سے لکھا ہے اور نہ اکبرآبادی قرار دیا ہے، بلکہ ان کا خیال ہے کہ وہ حیدرآباد کی رہنے والی تھی مگر مصنف تذکرۂ چمن انداز اور تذکرۂ شمیم سخن دونوں اسی بات پر متفق ہیں کہ وہ فرقہ بازاری سے تھی، اشعار کی زبان پاکیزہ اور صاف معلوم ہوتی ہے، نمونۂ کلام۔

ہر روز جو تم روٹھ کے تیوری ہو بدلتے — بے جا تو ہمیں ناز اٹھانا نہیں آتا
قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس — اک روز لپٹ کر شب مہتاب میں سونا
جو اک دن آپ پھر تشریف لائیں — رقیبوں کے گلے تم سے کہوں سب

دل ہمیں دو چار دن گر اپنا دو تم مستعار — اس کو سکھلائیں وفا ایسی کہ ہووے بے قرار
ہے چوکھٹ آپ کی اور سر ہمارا — قیامت تک یہیں ٹکرائیں گے ہم
اپنے آنے کی جو سناتے ہو — شیخی ناحق یہ تم جتاتے ہو
اس پہ قسمیں جو تم یہ کھائے ہو — مدعا یہ کہ دل لبھاتے ہو
لفظ رخصت زباں پہ لاتے ہو — جان کو میری تم کڑھاتے ہو
رات کو گاہ گاہ آتے ہو — اپنے کشتہ کو آ جلاتے ہو
دلبرؔ مجھے اس واسطے لکھتی ہے یہ سب خلق — تا مجھ کو تو دلبر ہی سمجھ کر کبھی آئے

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۶۴)

۱۰- صنمؔ: درگا بائی صنم اکبرآبادی، آگرہ کے کسی راجہ کے یہاں مجرا کرنے والیوں میں ملازم تھی، نہایت مال دار تھی، نہایت خوش اخلاق، مہذب اور ملنسار تھی، ایک صاحب نے مصنف تذکرۂ چمن انداز سے اس کا تخلص القط بتایا تھا مگر مصنف کے نزدیک وہ صحیح نہیں تھا، نمونۂ کلام۔

چھپایا گر رخ پُرنور اپنا — جیے گا طالب دیدار کیوں کر

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۱۱۲)

۱۱- فاطمہؔ: تخلص اور نام دونوں فاطمہ ہیں اکبرآبادی شاعرہ تھی، ماہ درخشاں کے مصنف نے ان کا یہ شعر غلطی سے فاطمہ دہلوی کے نام منسوب کر دیا ہے جب کہ یہ فاطمہ اکبرآبادی کا ہے، نمونۂ کلام۔

نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت — ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائے گا

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۱۲۷)

۱۲- قاتلؔ: فیروز آباد آگرہ کی باشندہ تھی، عجوبہ جان نام اور قاتل تخلص تھا، مہذب اور خوش مذاق تھی، طبیعت موزوں پائی تھی، گاہے گاہے شعر بھی کہتی، نمونۂ کلام۔

صدا جو جھانجھ کی پہونچی ہمارے کانوں میں — تو شوق دل نے نکالا مزار سے ہم کو
فقیر عشق ہیں قاتل خدا کے بندے ہیں — امید وصل ہے پروردگار سے ہم کو

(ماخذ: تذکرۃ الخواتین از عبدالباری آسی، ص ۱۲۹)

✡ ✡✡ ✡

اخبار علمیہ

آسٹریلیا کے ماہرین آثار قدیمہ نے انڈونیشیا کے جزیرہ فلورس میں لینگ بوا نامی جگہ کی کھدائی کی، اس کے دوران ان کو ۱۲ ہزار سال پہلے بسنے والے انسان کا پتا لگا جس کو انہوں نے ''ہوبٹ'' کے نام سے تعبیر کیا ہے، اس کا قد ایک میٹر اور کھوپڑی ایک بڑے سنترے کے برابر ہے لیکن اس کا بازو عام جسم کے لحاظ سے قدرے بڑا ہے، ماہرین کے خیال میں اس کی وجہ اس کا درختوں پر رہنا ہے، اس چھوٹے انسان کی ہڈیوں کی تحقیق کے بعد سائنس دانوں نے بتایا کہ وہ ایک معمر اور سن رسیدہ شخص کا ڈھانچہ ہے، اب تک اس قسم کے کل چھ ڈھانچے دست یاب ہوچکے ہیں۔

کیرولینا (امریکا) یونی ورسٹی کے ماہر آثار قدیمہ البرٹ سی گوڈیر نے نئے ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کی ہے کہ جنوبی امریکا میں انسان تیس ہزار برس پہلے پہنچا تھا، انہوں نے کہا کہ اکثر سائنس دانوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی اور انہیں مشکل سے یقین ہوگا کہ تقریباً ۵۰ ہزار برس قبل جنوبی امریکا میں انسان رہتے بستے تھے، انہوں نے کہا کہ جنوبی کیرولینا میں دریائے ساوانا کے کناروں کو کھودنے سے جو پتھر اور لکڑی کے کوئلے برآمد ہوئے ہیں ان کے مطالعہ و تحقیق سے ہمارے اس خیال کی ناقابل تردید شہادت ملی ہے۔

روسی سائنس داں حال ہی میں زمینی ماحول و فضا سے دور ایک پیغام رساں سیارچہ خلا میں بھیجنے کی تیاری کررہے ہیں، اس کا نام ''گلوناس-ایم 12 ایل'' ہے، حالاں کہ انہیں اس کا خدشہ بھی ہے کہ یہ مکمل نفع رساں اور مفید مطلب نہ ہو پھر بھی ان کا دعویٰ ہے کہ یہ سیارچہ خلا میں بسنے والے لوگوں کے متعلق جدید ترین معلومات کے مواقع فراہم کرے گا، یہ زمین سے بیس ہزار کلومیٹر بلندی پر ہوگا جہاں ان کے بہ قول وہ ہمیشہ ٹھہرا رہ سکتا ہے، اس میں المونیم کی پلیٹیں لگی ہوئی ہیں جس پر پیغام تحریری شکل میں خلا میں آباد لوگوں کو موصول ہوگا، ۲۰۰۵ء تک اگلے ''گلوناس-ایم'' کی تیاری ابھی سے کی جارہی ہے۔

جنوب مغربی جرمنی کے سواوین پہاڑ کے ایک غار میں بالکل ہاتھی کی شکل و شباہت کا جانور جس کی نسل اب معدوم ہے، اس کے دانت سے بنی ۳۵ ہزار برس پرانی ایک بانسری دست یاب ہوئی ہے، یہ آلۂ موسیقی ۳۱ ٹکڑوں میں منقسم ہے جو ٹوبنجین یونی ورسٹی (جرمنی) کے ماہرین کے مطابق وہاں کی اب تک کی سب سے قدیم دریافت ہے، حال ہی میں یہاں ہاتھی دانت سے بنی متعدد دوسری اشیا بھی پائی گئی ہیں، اس سے ماہرین آثار قدیمہ کو گمان ہوا ہے کہ کبھی یہاں انسانوں کی آبادی رہی ہوگی، بانسری کو انہوں نے کسی میوزیم میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

واشنگٹن یونی ورسٹی کے رچرڈ ولسن کا بیان ہے کہ انسان اور چکن (مرغ وغیرہ) کے تولیدی جرثومے میں قابل لحاظ مشابہت پائی جاتی ہے، ۳۱۰ ملین برس قبل انسان اور چکن کے نطفے کی الگ الگ نشو و نما ہوئی، مطالعہ میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ دونوں کی ہڈیوں کے بننے میں ایک ہی قسم کے پروٹین کی ضرورت ہوتی ہے، اس انکشاف سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے انسانوں میں ''فلو'' کی بیماری ''برڈ فلو'' جیسی ہو، محققین نے مارچ ۲۰۰۴ء سے چکن کے DNA کی سلسلہ وار تحقیق شروع کی اور بتایا کہ چکن پہلا پرندہ ہے جس کے DNA کی تعداد انسانوں کے بالمقابل ایک تہائی یعنی ۲۰ سے ۲۳ ہزار ہے، رسالہ ''نیچر'' میں شائع اس رپورٹ میں قطعی طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ چکن کے DNA میں دودھ اور دانت وغیرہ پیدا کرنے والے جرثومے یا عناصر مفقود و ناموجود ہیں۔

سائنس دانوں کے نظریے کے مطابق ۵ سو کروڑ برس پہلے نظام شمسی کا وجود ہوا تھا لیکن فی زمانہ خلا میں ہورہی تبدیلیوں اور بعض ہوش ربا حادثات کے مشاہدے کے بعد ماہرین فلکیات کا کہنا ہے کہ یہ منظر بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ زمین کی پیدائش کے وقت تھا، دو خلائی مسافروں نے تین نومولود ستاروں کے اردگرد دھول اور گرد و غبار کے گھنے بادلوں کے بیچ انفرا ریڈ کرنوں (تحت احمر شعاعوں) کی اٹھکھیلیوں کا مشاہدہ کیا ہے، اس سے ان کا خیال ہے کہ نظام شمسی میں بھی زمین جیسے دوسرے سیاروں کے وجود کا امکان ہے، کیوں کہ سورج کا وجود بھی گیس اور دھول کے ٹکراؤ کے بعد ہوا تھا، نیز انہوں نے نظام شمسی کے بیرونی حصوں میں بھاری بھرکم چٹان دیکھی جس کی سطح پر بشکل آبگینہ پانی جما ہوا ہے، اس بنا پر ماہرین علم نجوم کا خیال ہے کہ نظام شمسی کے باہری حصے میں شیشے کی طرح نظر آنے والی چٹان کی موجودگی کوہ آتش فشاں کے حادثہ کا نتیجہ ہوسکتی ہے، اس بلوری چٹان کا نام سائنس دانوں نے ''کواوور''

رکھا ہے، یہ چٹان کو یپر بلٹ میں "نیپچون" سیارے کے مدار سے باہری علاقوں میں دیکھی جاسکتی ہے، یہ سیارہ پلوٹو کا نصف یعنی ۱۳سو کلو میٹر وسیع و عریض ہوسکتا ہے، پلوٹو نظام شمسی میں اب تک کے دریافت شدہ سیاروں میں سب سے بعید مانا جاتا ہے، امریکی خلائی ماہرین ڈیوڈ جیوٹ اور جین لو کے بیان کے مطابق اس چٹان پر بے پناہ امونیا (نوشادر) سیال دھات موجود ہے، ان کا کہنا ہے کہ سیارہ "نیپچون" کا درجہ حرارت ۵۰ ڈگری سلسیش یا ۹۰ فارن ہیٹ رہتا ہے، جہاں تک اس آبگینی چٹان کا سوال ہے تو کم از کم اس کا درجہ حرارت ۱۰۰ ڈگری سلسیش یا ۱۸۰ فارن ہیٹ ہوگا، انہوں نے مزید کہا کہ اس بلوری چٹان کے مطالعہ سے نظام شمسی کے سربستہ رازوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یونی ورسٹی آف فلوریڈا کے محققین مریخ پر بیج اور پودے کو اگانے کی کوشش میں لگ گئے ہیں، اس کے لیے انہوں نے "جارس مارس" نام کی ایک تجربہ گاہ تعمیر کی ہے جس میں وہ مریخ کے موسم اور اس کی آب و ہوا کے متعلق یہ تحقیق کریں گے کہ وہاں پودے اگائے جاسکتے ہیں یا نہیں، اس پوری کوشش کا سہرا فلوریڈا یونی ورسٹی میں ایگریکلچرل اینڈ بایولوجیکل انجینئرنگ شعبہ کے پروفیسر بکلن کے سر ہے، انہوں نے کہا کہ اس سلسلے کے بعض تجربات ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں اور یہ کوشش دراصل مریخ کے ماحول اور آب و ہوا کو سمجھنے کی طرف ایک قدم ہے۔

روزنامہ "القبس" کی رپورٹ کے مطابق ماہ نومبر ۲۰۰۴ء کے پہلے پانچ دنوں میں ۱۹۴ افراد نے جن میں عورتیں بھی شامل ہیں، اسلام قبول کیا، انجمن تعارف اسلام کے سربراہ جناب خالد السمیع نے حلقہ بگوشان اسلام کی اس تعداد کو حوصلہ افزا بتاتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ اس میں مزید اضافہ ہوگا، انہوں نے بتایا کہ انجمن کی کوششوں کے نتیجے میں پچھلے سال اسلام لانے والوں کی تعداد ۶۰ ۴ تھی، مذہب اسلام سے لوگوں کی بڑھتی ہوئی دل چسپی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ خارج از امکان نہیں ہے کہ سال رواں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سابقہ تمام ریکارڈوں کو عبور کرجائے گی، انجمن کے "افطار الصائم" پروگرام میں افطار کے بعد نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے لکچروں کا اہتمام کیا گیا اور ملکوں اور زبانوں کے اختلاف کے مدنظر ترجمانی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

ک، ص اصلاحی

✿ ✿✿ ✿

ادبیات

غزل

از:- پروفیسر انوار احمد ☆

وقت تعبیرِ صدا ایست کہ من می دانم ‏ ‏ بشنو، این بانگ درا ایست کہ من می دانم

فکر بیش و کم مقسوم در ایں جاست عبث ‏ ‏ منزلت روز جزا ایست کہ من می دانم

عالم و عالمیان مست نوای عجب اند ‏ ‏ پردگی[1] پردہ سرا ایست کہ من می دانم

از رہِ مصلحت تہمت زدند بر آہوی چین ‏ ‏ بوی ایں مشک ز جا ایست کہ من می دانم

بشکند جام تہی بر سر جم وہ چہ عجب ! ‏ ‏ اینک ایں ظرف گدا ایست کہ من می دانم

شش جہت آئینہ نور جمالت پیدا ست ‏ ‏ ستر تو نیز ادا ایست کہ من می دانم

بیش دو روز اقامت نکند ہیچ کسی ‏ ‏ ایں جہاں کہنہ سرا ایست کہ من می دانم

تا کہ ہشیار بمانی کہ ز دستت نرود ‏ ‏ وقت ار زندہ متاعیست کہ من می دانم

ایں ہمہ شور و جنون، مکر و فسون عالم ‏ ‏ عشوہ از ماہ لقا ایست کہ من می دانم

خارہا تشنہ در ایں بادیہ ہر سو نگرند ‏ ‏ منتظر آبلہ پا ایست کہ من می دانم

غبغب یار فسوں کار صفائی دارد ‏ ‏ ہم در آں، آب بقا ایست کہ من می دانم

اہل افرنگ جفا کیش خداہا سازند ‏ ‏ اکنوں یک تازہ خدا ایست کہ من می دانم

انور ایں جادۂ تحقیق بہ پایاں نہ رسد ‏ ‏ تشنگی راہ نما ایست کہ من می دانم

---

[1] پردگی = محجوب، مستور۔

☆ سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونی ورسٹی مسکن کوٹھی، باقر گنج، گولہ روڈ، پٹنہ۔

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

ماہنامہ افکار، صہبا لکھنوی نمبر: مدیر ڈاکٹر حنیف فوق، صفحات ۵۵۶، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت ۲۵۰ روپے، زر سالانہ ۲۵۰ روپے، پتہ: سی ۱۵۰؍ انٹرنیشنل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی، ۷۴۴۰۰، ہندوستان کا پتا: ڈاکٹر حنیف شاہ خاں، ان آر او، اے ری ۲۲۷۷، سنڈیکیٹ بینک INT، بزنس BR، اے-۴۰ کناٹ پلیس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

جناب سید شرافت علی صہبا لکھنوی اور ان کے رسالہ افکار کی حیثیت قریب نصف صدی سے لازم و ملزوم کی سی رہی، رسائل کی دنیا میں افکار کو ہمیشہ اعتبار حاصل رہا، اسی طرح ایک مخلص و وضع دار ادیب و شاعر، محقق اور مدیر کی حیثیت سے صہبا مرحوم کو بھی افتخار نصیب ہوا، ریاست بھوپال میں ان کی نشو و نما ہوئی، سرزمین لکھنؤ سے اجداد کا تعلق تھا، انہوں نے اسی نسبت کو ترجیح دی، تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی کے ہو گئے لیکن اردو کی محبت اور اس کی آفاقیت نے ان کی شہرت کو کبھی محدود نہیں رکھا، ۲۰۰۲ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کی کمی کا احساس پوری اردو دنیا کو ہوا، اندیشہ ہوا کہ ان کی مفارقت کا صدمہ رسالہ افکار کے لیے قابل برداشت نہ ہو، لیکن ان کی صاحب زادی محترمہ مقصودہ صہبا کی ہمت اور ڈاکٹر حنیف فوق کی لائق ادارت نے افکار کی شکل میں نشہ صہبا کی سرمستی و سرشاری میں فرق نہیں آنے دیا، ان کے سلیقہ و حوصلہ کی مثال یہ ضخیم نمبر بھی ہے جس میں جناب صہبا مرحوم کی شخصیت ادیبانہ و شاعرانہ خدمات خصوصاً افکار کے زمانہ ادارت کے متعلق مختلف ابواب کے تحت عمدہ اور مفید تحریریں یکجا کردی گئی ہیں، حصہ نظم بھی کم نہیں، آخر میں خود صہبا مرحوم کی نظموں اور مضامین کا ایک انتخاب بھی ہے، فاضل مدیر کے قلم سے اداریہ بہ عنوان اشاریہ کے علاوہ ایک مفصل مضمون بھی ہے اور یہ گویا اس نمبر کا حاصل ہے، یہ کہنا درست ہے کہ صہبا اور افکار نے زندگی بھر انسانی زندگی کی ترقی پسندانہ فکری و ادبی سرگرمیوں کی آب یاری کی، وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہی نہیں اس کے منادی بھی تھے لیکن ان کی طبعی شرافت و شرقیت نے

ان کے قلم کی رفتار کو وہ جولانی نہیں دی جس کے اثر سے ان کے کئی ہم عصر ترقی پسند اہل قلم بے مہار گردانے گئے، اس راہ میں وہ ہر اندیشہ سود و زیاں سے بے نیازانہ گزرے، وجہ یہی تھی کہ ان کے پیش نظر مادی و مالی آسائش سے زیادہ حریت افکار کی اہمیت تھی، ان کی شخصیت کے گرد ادب کا ہالہ بڑا نمایاں رہا لیکن وہ خود تفوق کے پندار سے آزاد رہے، ان کی تصنیفات کی فہرست مختصر ہے اور اس کی وجہ شاید افکار کی ادارت کی غیر معمولی محنت بھی ہو لیکن اقبال اور بھوپال جیسی کتاب ان کی تصنیفی صلاحیت کے اعتراف کے لیے کافی ہے، اس کے علاوہ انہوں نے افکار کے قریب پینتالیس خاص شمارے بھی شائع کیے، ان میں اقبال، حفیظ، جوش، فیض، ندیم احمد قاسمی کے متعلق ایسے خصوصی شمارے ہیں جن کی حیثیت دستاویز سے کم نہیں، برطانیہ میں اردو کے متعلق ان کا خاص نمبر بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھا گیا، ان کی زندگی کی روداد واقعی رشک کے لائق ہے اور اس خاص شمارے میں اس زندگی کے قریب ہر گوشے کو روشن کیا گیا ہے، یہ احساس غلط نہیں کہ افکار کی صورت میں، رہ جائے گا زندہ نام صہبا لکھنوی۔

جریدہ، متروکات-لغت، متروکات کی تاریخ دستاویزات کی روشنی میں: مرتبہ جناب سید خالد جامعی، جناب عمر حمید ہاشمی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۳۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف کے ترجمان جریدہ کے بعض اہم شماروں مثلاً فلسفہ لسان پر اہم تحقیقی مطالعات اور قدیم لسانیات و ادبیات نمبر کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، مباحث کی انفرادیت، مضامین کی جدت اور غیر معمولی تحقیق و محنت کی وجہ سے ان شماروں کی افادیت ایک حقیقت ہے جس کی وجہ سے اب جریدہ کی اشاعتوں کا انتظار رہتا ہے، زیر نظر شمارہ بھی گزشتہ نمبروں کی طرح داد کے لائق ہے، افسوس ہے کہ اس کا حصہ اول ہم کو نہیں ملا جس میں متروک الفاظ اور ان سے متعلق عالمی سطح پر ہونے والی کاوشوں کا ذکر ہے، زبانوں کے عروج و زوال کی تاریخ، فوجوں اور ملکوں کی تاریخ سے کم دل چسپ نہیں اور ان کے اسباب کا مطالعہ و ادراک تنقید و تحقیق کے دامن کو اور زیادہ ثروت مند ہی کرتا ہے، زیر نظر شمارے میں پچھلی صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک اردو کے ذخیرہ الفاظ اور لہجہ و اسلوب و بیان میں مسلسل تبدیلیوں کا

جائزہ لیا گیا ہے اور ج سے ق تک متروکات کی فہرست بھی ہے، دل چسپ ہونے کے ساتھ یہ بحث کے قابل ہے، مثلاً جانٹھ، جاداد، جار، جاف، جاکر جیسے الفاظ کے متروک ہونے میں شبہ نہیں لیکن جامہ بہ معنی لباس و پوشش یا جٹادھاری اور جمان جیسے الفاظ کی اس فہرست میں شمولیت محل بحث ہے، چیلنج کا لفظ بھی ہے، جس کی تشریح میں کہا گیا کہ اردو میں اس مفہوم کا کوئی لفظ نہیں، چنوتی ہندی لفظ ہے مگر کم مستعمل ہے، یہ بھی لکھا گیا کہ پہلے اس مفہوم میں تہدی کرنا عام طور پر رائج تھا، یہاں تہدی کا اصل املا تحدی ہونا چاہیے تھا، لغت متروکات سے پہلے اردو میں متروکات کی ایک بحث دستاویزات کی روشنی میں ہے، جس میں اردو کا دنیا کی کئی اہم زبانوں سے تقابل کیا گیا ہے، لسانیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں پرلطف معلومات ہیں مثلاً اردو میں متروکات کا عمل دیگر زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن یہ دعویٰ بہرحال محل نظر ہے کہ ۱۵۰۰ سو سالہ اور ایک ہزار سالہ اردو کے مخطوطات کے نمونے آج بھی ایک عام آدمی پڑھ سکتا ہے، اس جملے میں بھی ادعائیت ہے کہ اردو زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس میں تمام زبانوں کے الفاظ و اسالیب کی خصوصیات سمائی ہیں، اردو، ہندی اور انگریزی رسم خط کی بحث میں کہا گیا کہ اردو حروف کی بنیادی شکلیں پندرہ ہیں اور گیارہ حروف ایسے ہیں جو شکل نہیں بدلتے، اس کے مقابلے میں انگریزی کے چھبیس حروف کو تین طرح سے یعنی ۷۸ شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا ضروری ہے، اس عمدہ شمارے کے لیے جامعہ کراچی کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور جریدہ کے مرتبین لائق مبارک باد ہیں۔

ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نمبر (اشاعت خاص-۲): مدیر پروفیسر خورشید احمد، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۵۷۰، قیمت ۸۰ روپے، زر سالانہ ۲۰۰ روپے، پتہ: ۵-اے، ذیل دار پارک، اچھرہ، لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے حالات و افکار پر ماہ نامہ ترجمان القرآن کے خاص نمبر کے پہلے حصہ کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، زیر نظر شمارہ اس کا دوسرا اور آخری حصہ ہے، پہلے حصے کی طرح اس میں بھی مولانا کی زندگی، فکر، جد و جہد اور نتائج و ثمرات پر ان کے رفقا و معتقدین کے عمدہ مضامین آگئے ہیں، مضامین کے انتخاب و ترتیب میں یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ مولانا کو ایک طبقے تک محدود رکھنے کی بہ جائے، امت کے بڑے حصے کے لیے قابل قدر اور غیر مسلموں کے لیے

ایک معلم و مبلغ کی حیثیت سے پیش کیا جائے، شروع میں بڑی دردمندی سے گزارش کی گئی ہے کہ اگر کھلے دل سے مولانا مودودی کے قلمی آثار کا مطالعہ کیا جائے تو انصاف کی نظر مختلف نتائج کا مشاہدہ کر سکتی ہے، میاں طفیل احمد، مولانا محمد چراغ، نواب زادہ نصر اللہ خاں اور سیدہ حمیرا مودودی جیسے قریبی اعزہ و رفقا کی تحریروں سے مولانا مودودی کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے متاثر کن گوشے سامنے آتے ہیں تو پروفیسر خورشید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر عبدالمغنی اور ڈاکٹر محمود احمد غازی وغیرہ کے مضامین سے فکر مودودی بھی اور واضح اور روشن نظر آتی ہے، مولانا مرحوم کے اثرات اور ان کی عصری معنویت پر ڈاکٹر خالد علوی، مولانا جلال الدین عمری کے مضامین بھی تجزیہ و احتساب کی عمدہ مثال ہیں، ایک دل چسپ مضمون مستشرقین اور مولانا مودودی کے عنوان سے ہے، اس کے علاوہ افریقہ میں مولانا کے طرز فکر کی مقبولیت اور سندھی و پشتو میں مولانا کی کتابوں کے ترجموں کی تفصیل بھی خاصی معلومات افزا ہے، شروع میں فاضل مدیر کے قلم سے، اسلامی تحریکات اور اکیسویں صدی کے چیلنج فکر مودودی کی روشنی میں، کے عنوان سے نہایت مفصل اور مدلل تحریر اس خاص اشاعت کی جان ہے اور اس میں خاص طور پر سید مودودی کے طرز فکر کا جائزہ وسیع النظری اور بڑی حد تک غیر جانب داری سے لیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے فروغ میں پیش رووں کی فکر اور خدمات سے احترام اور وفاداری کے ساتھ استفادہ کرتے ہوئے نئے مسائل و معاملات سے نبرد آزما ہونے کی سعی کی جائے، یہ خاص شمارہ مولانا مودودی سے متعلق افہام و تفہیم میں بڑا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ماہ نامہ جام نور دہلی، رئیس القلم مولانا ارشد القادری نمبر: مدیر جناب خوشتر نورانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۹۶، قیمت ۱۰۰ روپے، زر سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: ماہ نامہ جام نور، ۴۲۲، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶۔

تقریر و تحریر، درس و تدریس اور گوناگوں قومی و ملی سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا ارشد القادری نے خاص شہرت حاصل کی، اپنے طبقہ میں وہ رئیس القلم، قاید ملت اور مناظر اعظم کے القاب سے معروف تھے لیکن دوسرے مسالک فکر میں بھی ان کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا اعتراف تھا، تعلیم و تبلیغ کے میدان میں ان کی مساعی خاص طور پر مستحسن قرار پائیں، ان کی ایک شناخت مسلکی مناظر کی بھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کے لیے اس سے کہیں زیادہ وسیع اور وقیع میدان

عمل کی ضرورت تھی، ان کو شاید اس کا احساس بھی تھا کہ ''اہل سنت کے سارے علما و مشائخ (الا ماشاءاللہ) صرف جلسہ، جلوس اور پیری مریدی کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں، کوئی بھی اس رخ پر نہیں سوچتا کہ ہمارے داخلی اور خارجی مسائل کیا ہیں، طاقت ور دشمنوں کے بیچ میں ہماری مسجدیں اور ہماری درس گاہیں کیوں کر محفوظ رہیں گی؟'' جمشید پور کے فرقہ وارانہ فساد میں انہوں نے بڑی جرأت و ہمت سے ظالموں کا مقابلہ کیا، گرفتار بھی ہوئے اور ان کی گرفتاری کے خلاف ہر طبقے نے صدائے احتجاج بلند کی، اس خاص شمارے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا سیر حاصل جائزہ بڑے سلیقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔

مجلہ جمعیت ابنائے سلفیہ، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی نمبر: کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت درج نہیں، پتہ: جمعیت ابنائے سلفیہ، دربھنگہ، بہار۔

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی مرحوم، بہار ہی نہیں پورے ملک میں اپنی پرخلوص سرگرمیوں اور خوبیوں کی وجہ سے احترام اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے ان کی تعلیمی و فلاحی جد و جہد بڑی مبارک و مسعود تھی، بہار میں دار العلوم احمدیہ سلفیہ اور ملت کالج سے سلفیہ یونانی میڈیکل کالج تک ہر جگہ ان کی سعی و جہد کی اب بہار ہے، جماعت اہل حدیث کے رکن رکین اور مسلک سلفیہ کے شدید عامل ہونے کے باوجود وہ تحزب و تعصب سے پاک رہے، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے علاوہ دیوبند و ندوہ سے ان کے مخلصانہ مراسم تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو خاص تعلق تھا، خوشی ہے کہ ایسی قابل قدر ہستی کی زندگی کے نقوش کو یکجا اور روشن کرنے کی سعی اس مجلہ کے ذریعہ کی گئی ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فعال و متحرک شخصیت کے لیے اس سے بہتر پیش کش کی ضرورت ہے اور اس کے لیے یہ مجلہ خاصا معاون ہو سکتا ہے۔

سہ روزہ دعوت، تحفظ شریعت اور آزاد ہندوستان نمبر، حصہ دوم: مدیر جناب پرواز رحمانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۲۶، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: دفتر دعوت، ڈی ۲۱۲، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔

روزنامہ اور سہ روزہ اخبار دعوت، اردو صحافت بلکہ ہندوستانی صحافت میں اس لحاظ سے منفرد اور نمایاں رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ تعمیری اور مقصدی جذبے کو ملحوظ رکھا، مادی نفع و نقصان کی میزان سے وہ

ہمیشہ گریزاں رہا، ایک خاص جماعت کے ترجمان ہونے کے باوجود اس نے قوم و ملت اور ملک کے اجتماعی مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ہر اہم ملی مسئلہ پر سنجیدہ مضامین اور تبصروں کے ذریعہ اپنے قارئین کو اصل مسائل اور ان کے حل سے روشناس کرایا، تقسیم ہند کے بعد جن مسائل نے مسلمانوں کو بے چین و مضطرب رکھا ان میں دستور ہند کے تحت مسلم پرسنل لا میں حکومت کی متوقع مداخلت کا اندیشہ اور وقتاً فوقتاً حکومت اور عدلیہ اور سیاسی جماعتوں کی جانب سے کسی نہ کسی شکل میں اعتراض و حملہ خاص طور پر نمایاں رہا، ملت اسلامیہ ہندیہ کے اہل حل و عقد نے اس خطرے کی اہمیت محسوس کی کہ اس راہ سے ان کی شریعت کے بنیادی اصولوں پر تیشہ زنی مقصود ہے، یکساں سول کوڈ کا مطالبہ اگرچہ ناقابل عمل ہے لیکن اس کی تکرار میں سماجی اصلاح سے زیادہ سیاسی مقاصد کارفرما ہیں، ۸۵ء میں شاہ بانو کیس نے یہی ثابت کیا، اس موقع پر مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت اور مسلمانان ہند کے اتحاد نے تحفظ شریعت کی اہمیت اور واضح کر دی، اخبار دعوت نے بھی اپنے مضامین اور تبصروں سے بڑی رہنمائی کی، زیر نظر خاص شمارے میں ایسی تمام تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، یہ محض وقتی نہیں، فقہ اسلامی کے ایک اہم مضمون کی حیثیت سے یہ مستقل مباحث ہیں، اس لیے یہ شمارہ واقعتہً دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔

ماہ نامہ ہمدرد نونہال، خاص نمبر: مدیر اعلا جناب مسعود احمد برکاتی، عمدہ کاغذ خوبصورت طباعت، صفحات ۲۲۴، قیمت: ۲۵ روپے، زر سالانہ: ۱۶۰ روپے، پتہ: دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی۔

جناب حکیم محمد سعید شہید کے علم و حکمت کی قبولیت کا راز اس کے نفع و تاثیر میں ہے، حکیم شہید کی نظر دوا کے علاوہ اصل مرض پر ہمیشہ رہی، ان کے ادارہ ہمدرد نے پاکستان میں علم و صحت کی ترویج میں جو بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں بچوں کا رسالہ نونہال بھی بہت اہم ہے، بچوں کے مزاج، ذہن اور نفسیات کے مطابق ان کی شخصیت و کردار سازی میں یہ رسالہ شاید بچوں کے ادب میں سب سے ممتاز ہے، زیر نظر خاص شمارہ بھی مفید مضامین، خوب صورت ترتیب اور رنگین اور دل کش تصاویر کی وجہ سے خود اپنی روایت کی عمدہ توسیع ہے۔

ع ۔ ص

✡✡✡✡

مطبوعات جدیدہ

کتاب الملل والنحل: تالیف امام شہرستانی، مترجم پروفیسر علی محسن صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۷۷، قیمت: ۲۸۰/ روپے، پتہ: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳، کراچی یونی ورسٹی، کراچی۔

علوم اسلامیہ کے تاریخی سرمایہ و ورثہ میں کتاب الملل والنحل محتاج تعارف نہیں، اسلام کے معاصر اہم عالمی مذاہب اور خود مسلمانوں کے فرقوں کے حالات کا پانچویں صدی ہجری سے اب تک یہ مستند متداول ماخذ ہے، امام محمد ابوالفتح شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ نے عالم اسلام کے دور ابتلا میں اس اہم کتاب کی تالیف سے سیاسی زوال اور طوائف الملوکی کا داغ مٹانے کی کامیاب کوشش کی، وہ کثیر التصانیف صاحب قلم تھے لیکن شہرۂ عام اور بقائے دوام کی ضامن ان کی یہی کتاب الملل والنحل ثابت ہوئی، مختلف فصلوں اور ابواب میں منقسم، اہل اسلام، اہل کتاب، شبہ اہل کتاب، مجوس اور ہنود جیسے مذاہب اور ان کے تمام فرقوں کی تفصیل ایک حیرت انگیز علمی کارنامہ ہے، تاہم اردو زبان میں اس کا مکمل ترجمہ اب تک نہیں ہوسکا تھا، اس علمی ضرورت کو زیر نظر کتاب کے فاضل مترجم نے بہ حسن و خوبی پورا کیا، وہ کراچی یونی ورسٹی کے نیک نام معلم ہی نہیں، عربی زبان کے فاضل خصوصاً ترجمہ نگاری کے فن میں کامل بھی ہیں، اس سے پہلے بھی ان کے قلم سے کئی کامیاب ترجمے آچکے ہیں، تاریخ جہاں کشا کے ترجمہ کا ذکر ان صفحات میں چند ماہ قبل ہوا ہے، کتاب الملل جیسی کتاب کے اعلا علمی پایہ کو برقرار اور اس کے اسلوب کی عظمت کو قایم رکھنے کے ساتھ اس کو عام فہم بنانے میں مترجم کے لیے سخت آزمایش تھی لیکن وہ اس سے بہت کامیاب گزرے ہیں، شروع میں مبسوط مقدمہ کتاب اور صاحب کتاب کے متعلق ہے، تحقیق و توضیح کے لحاظ سے یہ بجائے خود بہت اہم ہے، تاہم بعض عبارتیں مبہم اور وضاحت طلب بھی آگئی ہیں مثلاً مامون کے دربار علمی کے بارے میں لکھا گیا کہ "یہاں علما کو نہایت آزادی سے اظہار رائے کا موقع دیا گیا، وہ مذاہب جو اپنی قومی حکومتوں کے دور میں بھی جرأت اظہار پر قادر نہ تھے، یہاں کھل کر اپنے عقاید بیان اور ثابت کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے" اس دور میں قومی حکومتوں اور جرأت اظہار پر قدرت نہ رکھنے والے علما کی بہ طور مثال نشان دہی مناسب ہوتی، بعض عبارتوں میں عربیت کے غلبے کی شدت نمایاں ہے جیسے "حکومتی استظہار کو توفق حاصل ہوگیا" توفق شاید تفوق ہے، "علم و فضل کی تلاشی و تنزل" میں تلاشی ناقابل فہم ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، کتاب کا نام کتاب الملل والنکل لکھا گیا ہے، شروع میں متنبی کے ایک مشہور شعر کی غلطی بھی ناگوار گزرتی ہے کہ والسیف والرمح والقرطاس والقلم۔　ع - ص

☆☆☆

دار المصنفین کا سلسلہ ادب و تنقید

Rs	Pages		
85/-	248	علامہ شبلی نعمانی	۱۔ شعر العجم اول (جدید محقق ایڈیشن)
65/-	214	علامہ شبلی نعمانی	۲۔ شعر العجم دوم
35/-	192	علامہ شبلی نعمانی	۳۔ شعر العجم سوم
45/-	290	علامہ شبلی نعمانی	۴۔ شعر العجم چہارم
38/-	206	علامہ شبلی نعمانی	۵۔ شعر العجم پنجم
25/-	124	علامہ شبلی نعمانی	۶۔ کلیات شبلی (اردو)
80/-	496	علامہ شبلی نعمانی	۷۔ شعر الہند اول
75/-	462	علامہ شبلی نعمانی	۸۔ شعر الہند دوم
75/-	580	مولانا سید عبد الحئی حسنیؒ	۹۔ گل رعنا
45/-	424	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۰۔ انتخابات شبلی
75/-	410	مولانا عبد السلام ندوی	۱۱۔ اقبال کامل
50/-	402	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۱۲۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)
65/-	530	قاضی تلمذ حسین	۱۳۔ صاحب المثنوی
75/-	480	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۴۔ نقوش سلیمانی
90/-	528	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۵۔ خیام
120/-	762	پروفیسر یوسف حسین خاں	۱۶۔ اردو غزل
40/-	266	عبد الرزاق قریشی	۱۷۔ اردو زبان کی تمدنی تاریخ
75/-	236	عبد الرزاق قریشی	۱۸۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام
15/-	70	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۱۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات
70/-	358	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۲۰۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ
140/-	422	خورشید نعمانی	۲۱۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول)
110/-	320	خورشید نعمانی	۲۲۔ دار المصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم)
95/-	312	علامہ شبلی نعمانی	۲۳۔ موازنہ انیس و دبیر